۷۸۶
۱۱۰-۹۲
یا صاحب الزماں ادرکنی

NOT FOR COMMERCIAL USE

www.ziaraat.com

لبیک یا حُسینؑ

خصوصی تعاون: نذر عباس
رضوان رضوی

اسلامی کُتب (اردو) DVD

ڈیجیٹل اسلامی لائبریری ۔

SABEEL-E-SAKINA
Unit#8,
Latifabad Hyderabad
Sindh, Pakistan.
www.sabeelesakina.co.cc
sabeelesakina@gmail.com

یه کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ھیں

مو منین بھی اس سے استفادہ حاصل کر سکتے ھیں.

منجانب.

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان

قرآنی حروفِ مقطعات کے کچھ معجزانہ پہلو

حروفِ اعجاز

سید منتظر عباس نقوی

ناشر
صدف پبلی کیشنز اسلام آباد

نام کتاب	:	حروفِ اعجاز
مؤلف	:	سید منتظر عباس نقوی
ناشر	:	صدف پبلیکیشنز اسلام آباد
		56، سٹریٹ نمبر 96، I-8/4، اسلام آباد
		ای میل: sadaf.publications@gmail.com
کمپوزنگ	:	میکسیما کمپوزنگ سینٹر
		موبائل: 0346-5927378
پرنٹنگ	:	میکسیما پرنٹنگ پریس راولپنڈی
تعداد اشاعت	:	ایک ہزار
تاریخ اشاعت	:	شعبان المعظم ۱۴۲۹ھ / اگست 2008ء
بار اشاعت	:	اول
ہدیہ	:	125

ملنے کے پتے

(۱) **اسلامک بک سینٹر**

مکان نمبر 362-C، گلی نمبر 12، G-6/2 اسلام آباد

(۲) **معصوم پبلیکیشنز بلتستان**

منٹھوکھا، سکردو بلتستان، maximahaider@yahoo.com

ISBN 978-969-8463-01-4

فہرست

صفحہ نمبر	عنوان

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

حروفِ اعجاز......۵

عنوان	صفحہ نمبر

حروفِ اعجاز ۶

عنوان	صفحہ نمبر

حروفِ اعجاز ۷

اسم اعظم ۱۳۰

یہ بھی پڑھ لیجیے

یہ چند صفحات..... شاید آپ ان کو پڑھنے کا ارادہ رکھتے ہوں، تو بسم اللہ، لیکن سن لیجیئے کہ ان کو پیش کرتے ہوئے نہ کوئی فخر ہے نہ کسی قسم کا دعویٰ۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان صفحات پر درج بہت سی باتیں بہت سے لوگوں کے لئے نئی ہوں گی۔

ان چند صفحات کو دو الگ الگ موضوعات میں منقسم سمجھئے۔

پہلا حصہ جو حروفِ مقطعات کے چند اعجازی پہلوؤں کے تذکرے پر مشتمل ہے درحقیقت راولپنڈی میں ۱۹۹۹ء پڑھے گئے ایک عشرۂ محرم کی تلخیص ہے۔ (سلام ہے ان لوگوں کو جنہوں نے یہ سب کچھ سنا بھی تھا اور برداشت بھی کیا تھا چاہیں تو ان صفحات کے پڑھنے والے بھی خود کو اس سلام میں حصہ دار سمجھ لیں)۔

دوسرا جزو دو عدد ضمیموں پر مشتمل ہے۔ یہ ضمیمے بیسویں صدی کی ساتویں اور آٹھویں دہائی میں تیزی سے نامور ہونے والے اور پھر اس سے زیادہ تیزی سے گوشۂ گمنامی میں چلے جانے والے ڈاکٹر خلیفہ رشاد کے متعلق ہیں۔ بظاہر خلیفہ رشاد آج کی سیاست کی ایک مقبول اصطلاح کے مطابق Non Issue ہے۔ لیکن 2008ء کے اوائل میں یہ احساس ہوا کہ انٹرنیٹ کے حوالہ سے بالعموم اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ

میں بالخصوص خلیفہ رشاد کا حلقہ بگوش ایک بہت چھوٹا سا گروہ بڑی تندہی سے سرگرم عمل ہے اور ملاّئیت کے پیش کردہ متشددانہ اسلام سے نالاں مسلمانوں کو اپنے دام میں گرفتار کرنے کے لئے کوشاں ہے۔ اُدھر، ادھوری معلومات کی بنا پر مشرق میں خصوصاً اردو، فارسی اور عربی زبانوں میں، خلیفہ رشاد کا ذکر اس کی ابتدائی عہد کی تحقیقات کے حوالے سے ہے۔ جیسے آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی کی زیرنگرانی تالیف کی گئی معرکۃ الآ راتفسیر نمونہ میں سورہ آل عمران کی تفسیر کے ابتدائی حصہ میں ''**ا ل م** ۔کمپیوٹر کے ذریعہ حروفِ مقطعات کی تفسیر'' کے عنوان سے خلیفہ رشاد کی تحقیقات کو ایک تفصیلی مقالے کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ میری محدود معلومات میں ڈاکٹر موصوف کے کام پر یہ سب سے زیادہ تفصیلی تحریر ہے جو اردو، فارسی یا عربی زبان میں تا حال لکھی گئی ہے۔

ابتدائی کارکردگی پر ستائشی تبصروں کے بعد، خلیفہ رشاد کی بعد کی کہی گئی غیر عقلی اور بے سروپا باتوں کی نہ کوئی تفصیل مشرق تک پہنچی نہ اس پر کسی ذمہ دار شخصیت نے کوئی تبصرہ کیا۔ اور اگر یہ باتیں پہنچ بھی جاتیں تو ان میں اس قدر وزن نہیں تھا کہ ہمارے علمائے کرام اس پر اپنا وقت ضائع کرتے۔ چونکہ مسائل ہم جیسوں کی سطح کے تھے اس لئے اس پر گفتگو بھی ہمیں کرنی چاہیئے تھی۔ یہ اور بات ہے کہ ہم نے اصل ماخذ تک پہنچنے میں دیر لگائی۔ چنانچہ اس پر گفتگو بھی دیر سے ہوئی ۔۔۔۔۔ یقیناً ان مسائل پر میرے عہد کے صاحب نظر حضرات مجھ سے کہیں بہتر طریقہ سے گفتگو کر سکتے ہیں۔ لیکن میری تحریر ناقص سہی، کمزور سہی کم از کم توجہ دلانے اور پہل کرنے کا شرف تو عطا کر دیجئے۔

منتظر عباس نقوی

معجزاتِ رسالتؐ

معاشرے میں موجود برائیوں اور خرابیوں کو دیکھ کر کوئی صاحب درد انسان اصلاح احوال کی تجاویز پیش کرے، تو باوجود اس کے کہ اس کی یہ تجاویز، ایک پیغام ہدایت کی حیثیت رکھتی ہیں، لیکن ہم اس دعوتِ اصلاح دینے والے کو زیادہ سے زیادہ ایک مصلح، مفکر، دانشمند یا ریفارمر کہیں گے، لیکن اگر وہ اپنی دعوتِ اصلاح کے ساتھ یہ بھی کہے کہ وہ یہ جو کچھ کہہ رہا ہے، یہ اس کا ذاتی پیغام نہیں، بلکہ وہ اس پیغام کو پہنچانے کے لئے اللہ کی طرف سے مامور ہوا ہے، تو ایسا مدعی، صرف ایک مصلح نہیں، بلکہ وہ اللہ کی نمائندگی یا نبوت کا دعویٰ کر رہا ہے۔ اور دعویٰ نبوت ایسی بات ہے کہ اگر مدعی جھوٹا ہے اور اس کا دعویٰ غلط ہے تو خلق خدا کے لئے، اس کا انکار کرنا، یا کم از کم اسے نہ ماننا لازم ہو جاتا ہے، اور اگر دعویٰ حقیقت پر مبنی ہے، اور اہل دنیا تک پہنچ بھی گیا تو اللہ کی حجت تمام ہو گئی۔ اب ہمارے لئے لازم ہے کہ اس دعوت پر لبیک کہیں۔ جب کسی دعوے کے انکار یا اقرار پر انسانیت کی دنیاوی اور اخروی نجات کا انحصار ہو جائے تو مخلوق کو حق پہنچتا ہے کہ وہ عدالت الٰہی سے توقع کرے کہ وہ اپنے نمائندے کو پیغام کے ساتھ، کوئی ایسی دلیل دے کر بھیجے، کوئی غیر معمولی کیفیت، کسی منفرد اور عجیب عمل کی قوت، کہ جسے مدعی نبوت اپنے منجانب اللہ ہونے کے ثبوت میں پیش کرے، تو یہ دلیل ایسی ہونی چاہیئے کہ نہ اس کو رد کرنا ممکن ہو، اور نہ اس کا جواب دینا ممکن ہو۔ قوتِ بشری اس عمل کو کر گزرنے

میں ہی بے بس نہ ہو بلکہ عقل انسانی اعتراف کرے کہ انسانی قوتوں سے ایسا کر گزرنا ممکن ہی نہیں ہے......... اللہ کی نمائندگی کے دعوے کے ساتھ اپنی سچائی کے ثبوت میں پیش کی جانے والی اس ناقابل تردید دلیل کو معجزہ کہتے ہیں۔

انبیائے سابق کے معجزوں کی نوعیت

یوں تو ہر نبی صاحب معجزہ ہوتا ہے لیکن ہر نبی کا معجزہ اس کے زمانے کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ علم، فن یا ہنر کے میدان میں ہوتا ہے۔ تاکہ انسان کو ایک طرف نوعِ بشر کے امکانات کی حدیں بھی معلوم ہوں، دوسری طرف اسی میدان میں وہ ایک ایسی بات کا مشاہدہ کریں جو فن کے کامل ترین افراد کے امکانات سے بلند تر ہو۔ اس لئے کہ ایک عام آدمی کے لئے تو کسی بھی صاحب فن کا مظاہرہ فن ناقابل عمل ہوتا ہے۔ ایک غیر ماہر کے لئے تو ماہر کی مہارت کا ہر مظاہرہ ایک نہ سمجھ میں آنے والا اور ناممکن عمل ہوتا ہے۔ اس لئے معجزہ وہی ہوگا جسے عام غیر ماہر افراد بشر ہی نہیں، بلکہ وہ جو ماہرین فن ہوں، وہ اعتراف کریں کہ ایسا ہونا انسان کی قدرت اور اختیار سے باہر ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جس دور میں آئے وہ جادو اور سحر کا دور تھا۔ اس لئے ان کو عصا کا معجزہ عطا ہوا۔ جسے دیکھ کر خود ساحروں نے تصدیق کی کہ ان کی پھینکی ہوئی رسیاں سانپ بن جائیں تو یہ جادو ہے، لیکن موسیٰ علیہ السلام کا عصا اگر اژدھا بن جائے تو یہ قوتِ بشری سے بالاتر بات ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب آئے تو طب کی ترقی کا دور تھا۔ صاحبانِ کمال بہت سے امراض کا علاج دریافت کر چکے تھے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بیماروں کو صحت یاب کرنے اور مُردوں کو زندہ کرنے کا معجزہ عطا ہوا۔ اور یہ عمل عام لوگوں کے لئے حیرت کی بات تھا ہی، جو اس عہد کے طبیب اور معالج تھے انہوں نے بھی تسلیم کیا کہ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا عمل انسانی اختیار اور قوت سے باہر ہے۔

آخری نبیؐ کا معجزہ ہر زمانے کے لئے ہے

جب دنیا میں آخری نبیؐ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے تو ان کی نبوت کے آخری ہونے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ان کی نبوت انسانیت کے باقی ماندہ سفر میں انسان کی رہنمائی کرتی رہے۔ اور جب اس نبوت کو قیامت تک رہنا تھا تو پھر اس نبوت کی دلیل، یعنی آخری نبیؐ کے معجزے کو بھی قیامت تک رہنا تھا۔ اور ہر معجزے کی یہ شرط تو پہلے ہی بیان ہو چکی کہ معجزہ صاحبانِ کمال کے نزدیک بھی ناقابل فہم اور ناقابل ارتکاب عمل ہوتا ہے۔ تو ماضی کا کمال انسانی، جو اس وقت تک موجود تھا، وہ تو تھا ہی، لیکن اللہ کے اس آخری رسول کو ان تمام صاحبانِ کمال سے بھی اپنے معجزے کے سامنے بے بسی کا اقرار کرانا تھا جو قیامت تک کسی فن میں کمال دکھائیں گے۔ چنانچہ ایک طرف تو حضورؐ نے وہ معجزے دکھائے جو ماضی کے تمام کمالاتِ انسانی پر فوقیت رکھتے تھے، دوسری طرف آپ نے وہ معجزے بھی چھوڑے جو آج تک، اور آج کے بعد آنے والے تمام زمانوں تک نسل انسانی کے تمام ممکنہ کمالات کے حد اختیار سے بالاتر ہیں۔

وہ معجزے جو ظہورِ اسلام کے ابتدائی دور کے انسانوں کے براہِ راست مشاہدے کا جزو بنے، اربابِ سیرت نے ان معجزوں کی تعداد چار ہزار سے دس ہزار تک بتائی ہے۔ ان میں سے تمام معجزے دلیلِ نبوت بھی تھے، حجت بھی تھے۔ لیکن نبیؐ کے بعد آنے والا زمانہ، عقل وخرد کی ترقی کا زمانہ تھا، انسانی شعور کے ارتقاء کا زمانہ تھا، انسانی حدود علم میں بے پناہ وسعت کا زمانہ تھا۔ چنانچہ، آخری نبی کو، ایک طرف تو ایسا معجزہ پیش کرنے کی ضرورت تھی جو عقل وشعور کے کمال کا مظہر ہو، جو عقل وشعور کی لامحدودیت کا

حامل ہو..........۔

دوسری طرف یہ معجزہ اس وقت تک بطور دلیل موجود رہے جب تک انسان موجود رہے اور اسے ہدایت اور رہنمائی کی ضرورت موجود رہے۔ چنانچہ پیغمبر آخرالزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک نہیں، چار ایسے معجزے پیش کیئے جوان دونوں معیاروں کو پورا کرتے ہیں۔ یعنی وہ شعور وعقل انسانی کی بلندترین سطح کو مکمل طور پر حیران کر دینے کی بے پناہ خصوصیت بھی رکھتے ہیں، اور دوسری طرف آج بھی موجود ہیں اور قیامت تک بھی موجود رہیں گے.......... اللہ کے اس عظیم الشان پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان معجزوں کو جس تاریخی ترتیب سے پیش فرمایا ہے، ان کا اجمالی تعارف بھی اسی ترتیب سے کرایا جائے گا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پہلا معجزہ: کردارِ نبوت

جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پہلا معجزہ خود ان کا جامع اور کامل کردار تھا۔ آج دنیا کے کسی بھی صاحب عقل وشعور، کسی بھی عالم، کسی بھی صاحب نظر سے سوال کیجیے کہ اگر اللہ نوع انسانی کی رہبری اور رہنمائی کے لئے ایک رسول بھیجنا چاہے، تو آپ کی نظر میں اسے کن صلاحیتوں اور صفات کا مالک ہونا چاہیئے۔ اس کے کردار میں کون کون سی صفات موجود ہوں کہ وہ اپنے فرائض کو بخوبی ادا کر سکے۔ تو ہر انسان اپنے اپنے دائرۂ معلومات کی روشنی میں، اور اپنے اپنے معیارِ ہدایت ورہنمائی میں کسی ایک یا کئی خوبیوں کا تذکرہ کرے گا۔ حکمران کہیں گے کہ رسولؐ کا طرزِ جہانبانی انتہائی بلند پایہ ہونا چاہیئے، صاحب سیف کہے گا کہ وہ مردِ میدان ہو، عالم کہے گا کہ وہ علم وفضل میں یکتا ہو، فلسفی کہے گا کہ اس کے اقوال وافکار عقل کے تمام معیاروں پر پورے اتریں، اخلاقیات کے علمبردار بہت سی شخصی صفات کی موجودگی کو شرط قرار دیں گے۔ اس

طرح اللہ کے رسولؐ سے کیئے جانے والے، انسانی شعور اور عقل کے تقاضوں کی ایک طویل فہرست دستیاب ہو جائے گی لیکن فہرست کی طوالت سے دل برداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ لوگوں سے پوچھتے جایئے۔ اور ہر شخص کی بیان کردہ صفت رسالت کو درج کرتے جایئے۔ اس طرح جو فہرست صفات بنے گی وہ اس قدر عظیم الشان ہوگی، اس میں ایسی ایسی متضاد صفات ہوں گی کہ کسی ایک فرد واحد میں ان تمام خصوصیات کا پایا جانا امر محال نظر آئے گا۔ اس مرحلے پر اس صفات وکمالات کی فہرست کے ساتھ اگر آپ اللہ کے آخری رسولؐ کی شخصیت کی طرف رجوع کریں، تو آپ کو ایک حیران کن معجزے کا سامنا ہوگا کہ کائنات میں ایک کردار ایسا بھی ہے جو دنیا بھر کے بنائے ہوئے اس معیارِ عظیم پر نہ صرف یہ کہ پورا اترتا ہے بلکہ اس رسولؐ کی شخصیت میں تمام مطلوبہ صفات، تمام ممکنہ خوبیاں ہمارے بنائے ہوئے کسی بھی معیار سے بہت بلند ہیں۔ تاریخ ہدایت انسانی اپنی پوری تاریخ میں کسی ایک بھی ایسے کردار کی نشاندہی نہیں کرسکتی جو اپنے عقیدتمندوں کی بیان کردہ مبالغہ آمیز صفات کے ساتھ بھی، جامعیت اور ہمہ جہتی کے اعتبار سے آنحضرتؐ کے مقابل آنا تو درکنار، نزدیک بھی قرار دی جاسکے۔

غرض انسان کی فکر نبوت کے لئے جس اعلیٰ ترین کردار کا تصور کرتی ہے، حضورؐ کی شخصیت اس تصور سے بالاتر ہے۔ اور اس غیر معمولی خصوصیت کے ساتھ کہ انسان آج تک کوئی پسندیدہ صفت، کوئی قابل تعریف خوبی، کوئی کردار کا حسین وجمیل پہلو دریافت نہیں کرسکا جو اللہ کے اس رسولؐ کی ذات گرامی میں، اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ پہلے سے موجود نہ ہو۔ اس جامعیت اور عظمت کا یہ پہلو مزید حیرتوں سے دوچار کردیتا ہے جب یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اپنے ماضی کے مقابلے میں تو یہ کردار عظیم اور جامع تھا ہی، اس کردار کے آجانے کے بعد ڈیڑھ ہزار سال گزر گئے، اسی طویل مستقبل میں بھی

انسانیت کوئی ایسی خوبی دریافت نہیں کرسکی، جو کردار رسالتؐ میں پہلے سے موجود نہ ہو۔ چنانچہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سب سے پہلا اور لازوال معجزہ آپ کا جامع اور کامل کردار ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دوسرا معجزہ: قرآن

اپنے کردار کے ساتھ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عقل انسانی کے سامنے اس کی توجہ اور تصدیق کے لئے جو دوسرا معجزہ پیش فرمایا، وہ اللہ کا نازل کردہ وہ کلام تھا جو ایک کتاب کی صورت میں ہمارے درمیان موجود ہے۔

اللہ نے انسانیت کی ہدایت اور رہبری کے لئے جتنے بھی ہادی بھیجے، وہ تمام کے تمام اللہ ہی کے کلام کو مخلوق تک پہنچاتے رہے۔ ان انبیاءؑ کی طویل فہرست میں ۳۱۳ وہ نبی تھے جن پر اللہ کی طرف سے کتاب بھی نازل ہوئی۔ لیکن ان ۳۱۳ انبیاء میں سے ۳۱۲ نبی وہ تھے کہ جب اللہ کی کتاب پیش کرتے تو یہ ثابت کرنے کے لئے کہ یہ اللہ کا کلام ہے، کتاب کے ساتھ کوئی معجزہ بھی پیش کرتے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ ۳۱۲ انبیاء علیہم السلام کی کتابیں محتاج تھیں کہ کسی معجزے کے ذریعہ انہیں اللہ کی کتاب ثابت کیا جائے۔ صاحب کتاب نبی کوئی ایسا غیر معمولی کام کرے جسے سرانجام دینا انسان کی قوت اور اختیار سے بالاتر ہو، اور پھر اپنے اس معجزے کی بنیاد پر یہ تسلیم کرائے کہ وہ عام انسان نہیں بلکہ اللہ کی طرف سے انسانیت کی ہدایت کے لئے مقرر ہوا ہے، اور جب لوگ اسے فرستادہ خدا تسلیم کرلیں تو وہ اگر کسی کلام کو اللہ کا کلام کہے تو انسانیت اس کو خدا کا کلام تسلیم کرلے، ورنہ وہ کلام، یا وہ کتاب خود اپنے اندر کوئی ایسی دلیل نہیں رکھتی تھی کہ اسے خالق کا کلام تسلیم کرلیا جائے۔ لیکن دوسری طرف، قرآن وہ واحد کتاب الٰہی ہے جو خود کو

کتاب خدا ثابت کرنے کے لئے کسی دلیل، کسی معجزے کی محتاج نہیں ہے۔ یہ کتاب خود معجزہ ہے، خود اپنی صداقت کی دلیل ہے۔

جس وقت قرآن نازل ہوا، اس وقت اہل عرب کو اپنے بیان اور زبان پر بڑا ناز تھا۔ وہ خود کو عرب کہتے، یعنی بولنے والا، باقی تمام دنیا ان کے نزدیک عجم تھی، گونگی تھی، قوت گویائی سے محروم تھی۔ وہ اپنی فصاحتِ کلام کو بے مثل سمجھتے، اپنے طرزِ گفتگو کو لاجواب قرار دیتے.........اس مرحلے پر قرآن آیا، ان ہی زبان دان عربوں کی زبان میں، ان ہی کی لغت میں.........قرآن جانی پہچانی عربی میں بات کر رہا تھا، لیکن اس میں کوئی عجیب بات تھی کہ زبان کے بارے میں انتہائی حساس عرب چونک اٹھے، پہلے چاہا کہ نظر انداز کر دیں، لیکن اس کلام میں عجیب بات تھی، کہ خواہش اور کوشش کے باوجود اسے نظر انداز کرنا ممکن نہ تھا۔ انہوں نے اس کلام کو سن کر سب سے پہلے وہی کہا جو اکثر نہ سمجھ میں آنے والی بات کے لئے کہا جاتا ہے کہ یہ تو دیوانے کی بڑ ہے، یہ کلام مجنون ہے۔ دیوانے کی بے سروپا بات اس قابل نہیں ہوتی کہ اس پر توجہ دی جائے، اس پر غور کیا جائے، لیکن قرآن تو عجیب کلام تھا کہ اپنے اوپر سے توجہ ہٹنے ہی نہیں دیتا تھا۔ نہ سننے کی خواہش کے باوجود کان اسی کی طرف لگے رہتے، ذہن میں الفاظ گونجتے رہتے.........عقل نے کہا اس کلام کا ربط دیکھو، اس کی معنویت دیکھو، اس کا تسلسل دیکھو، اس کا حسن دیکھو، اس کا اثر دیکھو، اسے تو دیوانے کی بڑ کہنا خود دیوانہ پن ہے.........پھر یہ کیا ہے؟ انہیں شاعری کے غیر معمولی اثرات کا اندازہ تھا، سوچا ہو نہ ہو، یہ شاعری ہے۔ لیکن شاعری تو ان کا روز کا ذریعہ اظہار تھی، عربوں سے زیادہ شاعری کو کون سمجھتا تھا، شاعری میں تو انہیں کمال حاصل تھا، چنانچہ شاعری کی ہر سطح اور ہر انداز کو جاننے والوں نے فتویٰ دے دیا کہ یہ کلام کچھ بھی ہو، کم از کم شاعری تو ہرگز نہیں ہو

سکتا۔۔۔۔۔۔۔۔عرب جس جس صنف کلام کو اچھی طرح جانتے تھے قرآن وہ نہیں تھا، پھر کیا تھا؟۔۔۔۔۔۔۔۔اچھا تو یہ جادو ہے، سحر ہے، لیکن انہوں نے کاہنوں کی کہانت دیکھی تھی، جادوگروں کے منتر سنے تھے، ساحروں کے طلسم کشا الفاظ سنے تھے، جب ان میں بھی کوئی مشابہت نہ ملی تو کہنا پڑا یہ جادو نہیں ہوسکتا، یہ سحر نہیں ہے۔۔۔۔۔۔۔۔پھر کیا ہے؟ آخر کس قسم کا کلام ہے؟

قرآن ان اصنافِ سخن میں کسی سے بھی نہیں ملتا تھا۔ اب عرب، اللہ کو کسی نہ کسی طور مانتے تو تھے لیکن اس کے اندازِ بیان سے واقف نہ تھے اس لئے ان کے لئے یہ کہنا تو مشکل تھا کہ یہ اللہ کا کلام ہے، البتہ بشر کے ہر بامعنی اور بے معنی کلام سے آشنائی ضرور تھی، اس لئے یہ تو جاننا ممکن تھا کہ یہ انسانی کلام ہے یا نہیں۔ اور پھر بشری کلام کے ہر انداز کو جاننے والوں نے اعلان کر دیا: ﴿**ما هذا كلام البشر**﴾۔

یہ کسی بشر کا کلام تو نہیں ہوسکتا۔ اب یہ اہل عرب کی علمی دیانت تھی کہ انہوں نے صرف اس بات کی گواہی دی جس سے وہ واقف تھے، جس سے ناواقف تھے اس کی شہادت کیا دیتے، لیکن ان کا یہ کہہ دینا کہ یہ کلام بشر نہیں ہوسکتا، واضح طور پر اعلان کر رہا تھا کہ جو کام انسان کے اختیار سے باہر ہو اسی کو تو معجزہ کہتے ہیں۔

پھر قرآن صرف فصاحت و بلاغت ہی کا معجزہ نہیں تھا۔ اگر قرآن کا سارا اعجاز زبان و بیان کے حُسن تک محدود ہوتا تو ان ہی لوگوں کے لئے ہوتا، اور اسی دور کے لئے ہوتا جب کلام کے حسن کو پرکھنے والی نگاہیں ہوں۔ قرآن کی فصاحت و بلاغت یقیناً معجزہ ہے، لیکن ان کے لئے جو پہلے تو عربی زبان کے ماہر ہوں، پھر سخن فہمی کی اس سطح پر ہوں جہاں حسن بیان کی باریکیوں کو سمجھ سکیں۔ ایسے صاحب نظر جب قرآن کو دیکھیں گے، بے ساختہ پکار اٹھیں گے کہ یہ اندازِ گفتگو انسانی قوت وقدرت سے بہت بالاتر ہے۔۔۔۔۔۔۔۔

لیکن اگر زمانہ وہ ہو کہ فصاحت کی اہمیت پر توجہ دینے والے نہ ہوں، بلاغت کی داد دینے والے نہ ہوں............ آج کے سائنسی دور میں شاعر اور ادیب کی زبانی نکتہ سنجی روز بروز اپنی قدر و قیمت کھوتی جا رہی ہے۔ آج کے عہد میں کوئی کلام فصاحت و بلاغت کی خواہ جتنے ہی حیران کن بلندی پر کیوں نہ ہو، صرف اپنے مطلب کو جیسے تیسے بیان کر دینے کو کافی سمجھنے والی دنیا، اس کلام کی اعجازی کیفیت کو محسوس نہیں کر سکتی۔ اگر کوئی کسی نابینا سے حسن صورت کی داد چاہے تو یہ محض ناسمجھی ہوگی۔ اگر قرآن صرف فصاحت اور بلاغت کے اعتبار سے معجزہ ہوتا تو صرف خاص لوگوں اور خاص زمانے میں بطور دلیل پیش ہوتا، لیکن اس کتاب کو تو نہ صرف یہ کہ قیامت تک رہنا ہے بلکہ قیامت تک بطور دلیل رہنا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس میں اعجاز کے وہ پہلو ہوں کہ انسانی ذہن اور اہل دنیا کا علم خواہ کتنا ترقی کر جائے، انسانیت کا ہر شعبہ، ہر دور میں تسلیم کرے کہ یہ انسانی کلام نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس کتاب میں ایک دو نہیں، بہت سے ایسے پہلو تھے جو عقل انسانی کو حیران کرتے رہے ہیں۔ جن کا جواب دیا جانا، جن کی مثل پیش کرنا انسان کے اختیار میں نہ گزشتہ کل تھا نہ آئندہ کل ہوگا۔

قرآن نے بہت سے کائناتی اور آفاقی حقائق بیان کئے ہیں۔ سائنس بھی اپنے ہر دور میں حقائق فطرت کے نقاب الٹتی رہی ہے۔ لیکن سائنس کی ترقی کا ہر دور اپنے ماضی کو غلط کہنے، اپنے سابقہ دعوؤں کی تردید کرنے کا دور ہے جو کل کہا تھا آج درست نہیں ہے۔ جو آج کہا جا رہا ہے وہ کل صحیح نہ رہے گا۔ آج کے سائنس دان نے تو برملا اعتراف کیا کہ سائنس جو کچھ کہتی ہے یہ حقیقت نہیں ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ ہم اسے اس وقت تک حقیقت سمجھتے ہیں جب تک اس کا غلط ہونا ثابت نہ ہو جائے۔ نیوٹن کے قوانین حرکت اس وقت تک درست ہیں جب تک نظریہ اضافیت اس کی خامیوں کی

نشاندہی نہ کر دے، نظریہ اضافیت اس وقت تک حقیقت ہے جب تک کوانٹم تھیوری اس کی غلطیوں کو منکشف نہ کر دے۔ لیکن قرآن نے جس بات کو بطور حقیقت بیان کر دیا وہ کبھی، کسی دور میں بھی غلط ثابت نہ ہو سکا۔ علم کی ترقی سائنسی حقائق کی غلطیاں نمایاں کرتی ہے، لیکن علم کی ہر ترقی نے کل نہ سمجھ میں آنے والے قرآنی بیانات کو آج درست ثابت کر دیا۔ آج پتہ چلا کہ حقیقت وہی تھی جو قرآن نے بیان کی تھی۔ اور ہم سابقہ مشاہدے کی بنیاد پر یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ آج قرآن کے جو پہلو ہماری فہم سے بالاتر ہیں وہ انسانی علم کی مزید ترقی کے منتظر بھی ہیں اور مزید ترقی کے امکانات کی نشاندہی کرنے والے بھی۔ انسانی فکر اور تحقیق کے حقائق کا ہر عہد میں بدلتے رہنا، اور قرآن مجید کی بیان کردہ سچائیوں کا ہر دور میں سچ رہنا قرآن کا ایک اور معجزہ ہے جو اسے انسان سے بالاتر ہستی کا کلام ثابت کرتا ہے۔

پھر قرآن ایک دن میں نازل نہیں ہوا۔ ۲۳ سال کا طویل عرصہ ہے اس کے نزول کا۔ وہ بھی مسلسل نہیں، چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں، وقت کے مختلف مرحلوں میں، حالات کے ہر آن بدلتے ہوئے تقاضوں میں، مزاج کی تبدیل ہوتی ہوئی کیفیتوں میں.......... مختلف اوقات میں کہی گئی باتوں میں لہجے کا فرق ہوتا ہے، انداز بدل جاتا ہے، نقطہ نظر میں تبدیلی آجاتی ہے لیکن قرآن دنیا کی وہ واحد کتاب ہے کہ اس قدر طویل دورانیہ میں اور اتنے چھوٹے چھوٹے اجزاء میں مکمل ہو اور نہ کہیں لہجہ بدلے، نہ فکر میں تبدیلی آئے، نہ مطالب میں فرق پڑے، نہ اندازِ بیان میں تغیر ہو۔

ایک عجیب بات کی طرف توجہ دلاؤں۔ قرآن حکیم آج اس ترتیب سے نہیں ہے جس ترتیب سے نازل ہوا تھا۔ پہلے نازل ہونے والی سورتیں بعد میں ہیں، بعد والی سورتیں پہلے ہیں، کہیں ابتداء میں نازل ہونے والا کلام ہے اسی کے ساتھ ہی آخری دور

میں نازل ہونے والی آیات ہیں، کہیں سورۃ مکہ میں نازل ہوئی اس میں کچھ آیات مدنی ہیں، کوئی سورۃ مدینہ میں نازل ہوئی اس میں کچھ آیات مکی ہیں۔ اور ترتیب کی یہ صورت ایک دو جگہ نہیں، پورے قرآن میں مسلسل یہی کیفیت ہے۔ (خیال رہے کہ یہ صورت حال کسی انسان کی طرف سے نہیں۔ یہ ترتیب خود اللہ کے حکم سے، اللہ کے رسولؐ کے ہاتھوں دی گئی) تو یہ بات بالکل واضح ہے کہ قرآن کو کتاب کی شکل دیتے ہوئے، نزول کی ترتیب کو بالکل خاطر میں نہیں لایا گیا۔ اس کی مصلحت تو اللہ اور اس کا رسولؐ جانے، مجھے تو اس وقت صرف یہ کہنا ہے کہ آج قرآن میں یہ دیکھنا ہو کہ کون سی آیت کہاں نازل ہوئی اور کس مقام سے لا کر کہاں رکھی گئی تو اس کا فقط ایک ذریعہ ہے، آپ تاریخ سے پوچھیں، مفسر سے پوچھیں یا کسی حدیث سے مدد لیں، کم از کم قرآن مجید میں ایسی کوئی داخلی علامت نہیں ہے جو کسی آیت کے وقت نزول کا تعین کر دے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی شاعر کی ابتدائی عمر کی شاعری اس کے آخری عمر کے کلام سے مختلف ہوگی۔ کسی فلسفی کے آغاز غور و فکر کے نتائج میں اور اس کے آخری عہد کے فلسفے میں ایک نمایاں ارتقائی کیفیت نظر آئے گی۔ لیکن قرآن مجید کے ہر دور کی آیتیں آپس میں ملی جلی ہیں اس کے باوجود نہ کہیں ناپختگی یا کہنہ مشقی کا فرق ہے، نہ افکار و خیالات میں کسی قسم کا ارتقاء یا تغیر ہے۔ کوئی قاری صرف قرآن پڑھ کر، محض لب و لہجے کے فرق سے، محض اندازِ فکر میں تبدیلی کی بنیاد پر یہ نہیں بتا سکتا کہ کون سی آیت مکی ہے اور کون سی مدنی ہے، کون سی ابتدائی عہد کی ہے اور کون سی آخری دور کی۔ میں نے ابھی عرض کیا کہ قرآن مجید میں نزول کے اعتبار سے موجودہ ''بے ترتیبی'' خود صاحب کتاب کا فیصلہ ہے۔ اس فیصلے کی اور بھی بہت سی وجوہات ہوں گی، لیکن اس وقت تو ایک یہ وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ پوری کتاب میں جگہ جگہ مختلف ادوار، مختلف زمانوں اور مختلف عہد کے کلام کو اس

لئے بھی ایک دوسرے کے ساتھ رکھ دیا گیا ہے کہ قیامت تک، جب بھی کوئی صاحب بصیرت انسان اس کلام کو دیکھے گا تو بے ساختہ تسلیم کرے گا کہ یہ کسی ایسے کا کلام ہے جس کی ذات میں نہ تغیر ہے، نہ ارتقاء ہے، نہ کیفیات ہیں۔ اور ایسی ذات سوائے معبود کے، سوائے بے عیب خالق کے اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ قرآن حکیم میں کوئی زمانی ترتیب نہ ہوتے ہوئے بھی، اس کا داخلی ربط، اس میں لب و لہجے کا، فکر کا، معنی و مطالب کا فرق نہ ہونا بھی ایک معجزہ ہے جو اس کلام کو اللہ کا کلام ثابت کر رہا ہے۔

پھر قرآن مجید ویسے ہی مجموعہ الفاظ ہے جیسے کوئی اور گفتگو ہو یا تحریر ہو۔ گفتگو مؤثر بھی ہوسکتی ہے اور غیر مؤثر بھی، لیکن اگر کچھ الفاظ میں کسی وقت تاثیر پائی جائے تو وہ الفاظ کے علاوہ بہت سے اور عوامل کی مرہون منت ہوتی ہے۔ لیکن قرآن حکیم کے الفاظ میں ایک غیر معمولی تاثیر ہے۔ ایک ایسا اثر کہ سمجھ کر سننے والا، اکثر محض الفاظ قرآن کو سن کر ہی بدل جاتا ہے.......... بہت سے فلسفی، بہت سے مصلحین، بہت سے مفکر، بہت سے معلمین اخلاق، انسان کی بھلائی اور رہنمائی کے لئے گاہے بگاہے بہت قیمتی اور گراں قدر جملے کہتے رہتے ہیں۔ یہ اقوال، اقوال زریں ہیں۔ لیکن تاثیر کے لئے قاری کی مخصوص معاون ذہنی کیفیت کے محتاج ہیں.......... یہ صرف قرآن کی خصوصیت تھی کہ اس کے سیدھے سادے جملوں کو سن کر بہت سے کافر مومن ہوگئے، ظالم اطاعت گزار ہوگئے، دشمن دوست ہوگئے، خدا سے گریزاں خدا پرست ہو گئے، شقی القلب رحمدل ہوگئے، بخیل فیاض ہوگئے، کمزور ایک باطنی طاقت سے سرشار ہوگئے، مریض صحت یاب ہوگئے، مصیبت زدہ راحت پا گئے، مضطرب دلوں کو سکون مل گیا.......... غرض انسان خوبصورت سے خوبصورت جملے تو کہہ سکتا تھا، لیکن ان جملوں میں لازوال اثر پیدا کرنا، ان میں تاثیر فراہم کرنا انسان کے اختیار میں نہیں تھا۔ اور جو کام انسان کے اختیار سے

باہر سو وہی معجزہ ہے۔

حضور ﷺ کا تیسرا معجزہ: توارثِ صفات

اور اب آیئے نبوت کا قائم و دائم رہنے والا ایک اور معجزہ۔ دنیا کے ہر صاحب عزت و حیثیت، ہر صاحب علم و ہنر باپ کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کی اولاد اگر اس سے زیادہ ترقی نہ کر سکے تو کم ازکم اس میں وہ تمام خوبیاں ضرور آ جائیں جن کا وہ خود مالک رہا ہو۔ ہنرمند چاہتا ہے کہ اس کا بیٹا بھی ہنرمند ہو، عالم کی تمنا اور کوشش ہوتی ہے کہ اس کا فرزند بھی عالم ہو، اپنے اعلیٰ اخلاق سے شہرت وعزت حاصل کرنے والا خواہش کرتا ہے کہ اس کی اولاد اس کی صفات کی حامل ہو۔ آرزو اپنی جگہ پر، لیکن مشاہدہ بتاتا ہے کہ اولاد باپ کی کمائی ہوئی دولت کی وارث تو ہو جاتی ہے، باپ کی جمع کی ہوئی جائیداد تو بیٹوں کو منتقل ہو جاتی ہے، اس کے سونے چاندی کے وارث تو ہو جاتے ہیں لیکن یہ بہت کم ہوتا ہے کہ باپ کا تمام علم، تمام ہنر، تمام فن، تمام اوصاف و صفات بھی اولاد کو منتقل ہو جائیں۔ اور اگر باپ کی کچھ قابل فخر خصوصیات اولاد میں منتقل ہو بھی گئیں تو تیسری نسل کے حصہ میں، اولاد کی اولاد میں، ان خصوصیات کا پہنچنا بالکل محال ہوگا۔ ایک انسان کا ذاتی مشاہدہ تو بہت ہی محدود ہوتا ہے۔ لیکن ایک مؤرخ نسلوں کے حالات پر نظر رکھتا ہے۔ چنانچہ مسلم دنیا کے نامور مؤرخ ابن خلدون نے، مقدمہ تاریخ میں یہ فتویٰ دے دیا کہ کسی فرد کی اعلیٰ صفات اور کمالات تیسری نسل تک منتقل نہیں ہوتے۔ ابن خلدون کی یہ بات تاریخ کے گہرے مشاہدے پر مبنی تھی کہ کسی فرد کی تین نسلیں یکساں عظمت کی حامل نہیں ہوتیں۔ اب اگر دنیا کے عام بڑے آدمیوں کی ایک بڑی صفت، تین نسلوں تک اپنی مکمل بڑائی کے ساتھ باقی نہیں رہتی، تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے خلق عظیم کا، آپ کے اس کردار کا جو تمام اعلیٰ صفات کا جامع ہو، جو ہر اعتبار سے کامل ہو، جو کردار ایک لازوال معجزے کی حیثیت رکھتا ہو، اس کا کسی ایک نسل میں بھی منتقل ہونا ناممکن ہوگا۔ اور اگر توارث صفات صرف تین نسلوں تک ممکن نہیں ہے تو چار، پانچ یا چھ نسلوں تک تو تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ لیکن وہ جو تمام انسانوں کے لئے ممکن نہ ہو، نہ صرف یہ کہ ممکن ہو جائے بلکہ یہ امکان حقیقت اور واقعہ ہو کر مشاہدہ کا جزو بن جائے، تو ایسے واقعہ کو معجزہ کہتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے حضورؐ کا تیسرا باقی رہنے والا معجزہ یہ دیکھا کہ آپ کا کردار منتقل ہوا۔ اور ایک دو میں نہیں، بلکہ مسلسل بارہ نسلوں میں منتقل ہوا۔ اور کردار رسالتؐ اس شان سے آگے بڑھا کہ قیامت تک کوئی عہد نہ رہا جب ایک نہ ایک فرد، کردارِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مکمل تصویر کی حیثیت سے دنیا میں موجود نہ ہو۔

اور پھر معجزہ در معجزہ، کہ باپ اپنی اولاد کو اپنی آغوشِ تربیت میں پروان چڑھائے تب بھی اپنی صفات اولاد کو نہ دے سکے اور یہاں صاحب کمال میں اور وارثانِ صفات میں صدیوں کا فاصلہ ہو، نگاہ ظاہر میں وارث نے مورث کو نہ دیکھا، نہ اس سے براہ راست کوئی تربیت لی، لیکن ہر نقل کردار اپنے اصل سے یوں مطابقت رکھے کہ ہر ایک پر اصل کا گمان ہو۔

یوں تو وارثانِ کردار رسولؐ کا ہر عمل جلوۂ کردار رسولؐ نظر آتا ہے۔ لیکن اگر اس آئینہ خانہ میں کردارِ رسولؐ کے جلوے اور نمایاں طور پر دیکھنا چاہیں تو فطرت انسانی کے ایک مسلمہ اصول کو رہنما بنالیں کہ انسان اگر کسی صفت، کسی خوبی کو پسند کرتا ہے تو وہ صفت جہاں جہاں نظر آتی ہے، اسے اچھی لگتی ہے، اور اگر اسے کوئی خصوصیت، کوئی عادت، کوئی رویہ اچھا نہ لگے، تو جہاں جہاں وہ طرزِ عمل سامنے آتا ہے، اس کی ناپسند کا نشانہ بنتا جاتا ہے۔ اب یہ تاریخی حقیقت ہے کہ کردارِ رسالتؐ کی خوبیوں نے انسانیت کے ایک بہت

بڑے گروہ کو عشق رسولؐ کے جذبے سے سرشار کر دیا تھا، دوسری طرف اپنی برائیوں سے چھٹکارا نہ پا سکنے والے نام نہاد انسانوں کی ایک جماعت ایسی بھی تھی جو اس عظیم کردار سے محبت کا رشتہ قائم کرنے کی بجائے، ذاتِ رسالتؐ سے دشمنی پر کمربستہ ہوگئی تھی۔ اب تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجیے، خواہ وہ عام مسلمان ہو، مقامِ تصوف کی کوئی شخصیت ہو، علم و فضل کا حامل کوئی صاحب قلم و بیان ہو، غرض جس جس نے جام محبت رسولؐ پیا، وہ کسی نہ کسی شکل میں، کسی نہ کسی انداز سے، کسی نہ کسی مقدار میں وارثانِ کردارِ رسولؐ کی محبت کا بھی دم بھرتا رہا۔ اور جس جس نے کردارِ رسالتؐ سے دشمنی کی وہ ہمیشہ کردارِ رسولؐ کے علمبرداروں سے بھی دشمنی کرتا رہا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوست آل رسولؐ سے محبت کرتے ہیں، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمن آلِ رسولؐ سے بھی دشمنی کرتے ہیں، کیا یہ حقیقت اس بات کا کھلا ہوا ثبوت نہیں کہ نبیؐ اور وارثانِ نبی کا کردار ایک ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چوتھا معجزہ: معجزات کی مطابقت

اور اب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دلائل نبوت، یعنی سلسلۂ معجزات میں سے ایک اور معجزہ۔ اور یہ معجزہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پہلے تین معجزوں کی طرح عقلی معجزہ ہے۔ اور یہ ہے پہلے تمام معجزوں کی مطابقت۔ اور یہ مطابقت بھی اس طرح کہ ہر معجزہ الگ الگ اپنی داخلی ساخت میں بھی مطابقت رکھتا ہے اور اجتماعی طور پر تمام معجزے آپس میں بھی مطابقت رکھتے ہیں۔ بات کسی قدر غیر مانوس ہے اس لئے تھوڑی سی وضاحت درکار ہوگی۔

حضور نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ ظاہری کی مدت تقریباً تریسٹھ سال ہے۔ قرآن حکیم تیس (۲۳) سال کے عرصہ میں نازل ہوا، اور وارثانِ

کردارِ رسولؐ کا دور حیات نبویؐ سے شروع ہو کر یوں تو قیامت تک کے زمانے پر محیط ہے، یعنی دو سو ساٹھ سال کا طویل عرصہ ایسا ہے جس میں اس سلسلے کے گیارہ افراد کا کردار لوگوں کی نگاہوں کے سامنے گزرا، اور آج بھی یہ کردار سیرتِ نبویؐ کی طرح اپنی تمام جزئیات کے ساتھ تاریخ کے صفحات پر موجود ہے۔ اب سرسری نظر سے دیکھنے پر یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ ہر معجزے کا ظہور ایک آن، ایک لمحے میں نہیں ہوا۔ بلکہ ہر معجزہ ایک قابل لحاظ طویل عرصے میں رونما ہوا۔ اب ایک فطری بات تھی کہ صرف وقت کا عامل تحریر پر بھی نمایاں اثر دکھاتا اور کردار بھی وقت کے اثرات سے متأثر ہوتا لیکن یہ حقیقت عقل انسانی کے لئے انتہائی حیران کن ہے کہ اتنے طویل عرصہ میں رونما ہونے والے یہ معجزات اپنی اپنی جگہ ہر تضاد، ہر اختلاف سے پاک، مکمل طور پر داخلی وحدت اور مطابقت رکھتے ہیں اور جب ان تمام معجزوں کو ایک دوسرے کے مقابل رکھا جاتا ہے تو یہ آپس میں بھی ایک دوسرے سے مکمل مماثلت کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔

پہلا معجزہ تھا کردارِ رسولؐ۔ تو کردار پر سن و سال کا فرق پڑتا ہے۔ علم اور مشاہدے کا فرق پڑتا ہے۔ تجربات و حادثات کا فرق پڑتا ہے۔ مختلف جذباتی کیفیتوں کا فرق پڑتا ہے۔ یہ فرق اس قدر یقینی ہے، اتنا معمول کے مطابق ہے کہ ہم نے اسے ایک مسلمہ اصول کی حیثیت دے دی ہے کہ عمر کے ایک دور کا کردار لازماً دوسرے دور سے مختلف ہوگا۔ اگر اس کے برعکس ہو تو اس پر ہم ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں۔ اگر کوئی جوان اس کردار کا مظاہرہ کرے جو بچپن کا طرزِ عمل تھا تو فوراً اعتراض ہوتا ہے کہ اتنے بڑے ہو گئے ابھی تک بچپنا نہ گیا۔ اگر ایک عمر رسیدہ شخص وہ حرکات کرے جو جوانوں کے ساتھ مخصوص ہیں تو ایسا بوڑھا معاشرے کی نگاہ میں طرح طرح کے مضحکہ اڑانے والے خطابات سے نوازا جاتا ہے۔ اس کے برعکس صورتِ حال کا بھی یہی حال ہے۔ جوانوں کو

بزرگوں کی متانت اور سنجیدگی زیب نہیں دیتی۔ بچے اگر بڑوں کی بات کرنے لگیں تو کہا جاتا ہے، برخوردار بڑے ہوگئے تو یہ باتیں کرنا۔ ابھی تمہاری عمر نہیں ہے کہ یہ بات کرو۔ چھوٹا منہ اور بڑی بات کا محاورہ بن گیا۔ یہ تمام رویے بتاتے ہیں کہ عمر کے مختلف حصوں میں انسانی کردار اس قدر نمایاں طور پر بدلتا ہے کہ ہم نے اسے فطرت کا قانون سمجھ لیا ہے اب آیئے کردار رسالتؐ کی طرف۔ ہمارے سامنے اس معجزہ کردار کے تمام مراحل موجود ہیں۔ بچپنا بھی، جوانی بھی اور بڑھاپا بھی۔ لیکن بچپن تھا، بچپنا نہیں تھا، جوانی تھی لیکن ہوش وخرد سے بیگانگی نہیں تھی، بڑھاپا تھا لیکن فکری یا عملی صلاحیتوں میں کہنگی نہ تھی۔ جو کردار بچپن کا، وہی جوانی کا اور وہی بڑھاپے کا۔ کردار کی یہ یک رنگی، سن و سال کے فرق سے یہ بالاتر رہنے کی کیفیت دلیل ہے کہ آپ کی پوری زندگی کا کردار ایک وحدت تھا، ناقابل تغیر اکائی تھا۔

پھر یہی نہیں۔ دنیا نے فیصلہ سنایا تھا کہ جنگ اور محبت میں ہر بات جائز ہے۔ لیکن اللہ رے کردار رسالتؐ کی پختگی، کہ جو چیز جنگ میں جائز ہے وہی زمانۂ امن و راحت میں جائز ہے، جس بات کو محبت میں حرام سمجھا وہ نفرتوں کے مرحلہ پر بھی ناجائز رہی.......... دنیا نے خوشی اور غم کے جذبات کی شدت دیکھی تو ان مرحلوں پر بہت سی رعایتیں دے دیں، لیکن حیاتِ رسالتؐ میں خوشی کا کوئی مرحلہ جامے سے باہر ہونے کا مرحلہ نہیں اور مصیبت کی کوئی گھڑی جادۂ حق سے ہٹانے کی گھڑی نہیں.......... فتح ہو یا شکست، گھر ہو یا مجمع عام ذاتی زندگی ہو یا اجتماعی رویہ، اپنوں کا معاملہ ہو یا غیروں کا مسئلہ، غرض کردار کا کوئی پہلو، کردار کا کوئی اصول، کبھی نہ بدلا۔ نہ ترمیم ہوئی نہ اختلاف ہوا.......... چلیے تضاد نہ ہوتا، ارتقاء تو ہوتا کہ پہلے صفات کی ابتدائی شکل ہوتی، ناپختگی کی سطح ہوتی، پھر مشق کے ساتھ، مشاہدے اور تجربے کے ساتھ پختگی آتی جاتی، لیکن کردارِ

رسالتؐ میں کوئی ارتقائی کیفیت نہیں۔ جیسے کردار، روزِ آخر کامل تھا ویسے ہی روزِ اول بھی کامل تھا۔

دوسرا معجزہ تھا قرآن۔ تو قرآن کے لہجے میں، اندازِ بیان میں، معنی مطالب میں شروع سے آخر تک یکسانیت کا، مطابقت کا تذکرہ کر چکا۔ اب صرف کہی ہوئی ایک بات کی مزید وضاحت کر دوں۔ میں نے عرض کیا کہ قرآن مجید ایک نشست میں نہیں، پورے تیئس سال میں نازل ہوا، تیرہ سال مکہ میں اور دس سال مدینے میں۔ پھر جب اسے کتاب کی صورت میں دنیا میں چھوڑا گیا تو اس ترتیب کا بالکل لحاظ نہیں رکھا گیا جس ترتیب سے قرآن نازل ہوا تھا۔ مکی سورہ کے بعد مدنی سورہ اور مدنی سورتوں کے درمیان مکی سورۃ۔ پھر آیتوں میں بھی کسی ایک مرحلے پر نازل ہونے والی آیتوں میں کسی دوسرے موقعہ کی آیتیں ہیں۔ مدنی اور مکی آیتیں بھی ملی جلی۔ پھر اگر ان آیات اور سورتوں کے موضوعات پر نظر ڈالیے تو دنیا کا کون سا موضوع ہے جس پر قرآن نے کچھ کہا نہ ہو، ابتدائے آفرینش سے لے کر قیامت، بلکہ اس کے بعد کے معاملات تک ہر مسئلے پر گفتگو کی گئی ہے.......... اب ذرا تصور کیجیے، ایک شخص صبح سے شام تک مختلف معاملات پر گفتگو کرے۔ اس ایک دن کی تمام باتوں کو جمع کیا جائے۔ اور جمع کرتے ہوئے اس بات کا لحاظ نہ کیا جائے کہ باتیں کس ترتیب سے کی گئی تھیں۔ صبح کی بات میں، جب وہ افرادِ خانہ کو دن بھر کی ذمہ داریاں سمجھا رہا تھا، شام کو کہے ہوئے ایک ایسے جملے کو رکھ دیا جائے جب وہ کسی راہرو کو راستہ سمجھا رہا تھا۔ دوپہر کی بات میں، جب وہ اپنے کسی کارکن کی غلطی پر اسے سرزنش کر رہا تھا، وہ جملہ شامل کر دیا جائے جو وہ اپنے کسی بچے کی امتحان میں شاندار کامیابی پر بطورِ تعریف کہہ رہا تھا، تو اس طرح صرف یہ نتیجہ نکلے گا کہ ایک اچھے خاصے معقول آدمی کی معقول گفتگو انتہائی نامعقول نظر آئے گی۔ ایسا

حاصل جمع بے ربطی کا شکار ہو جائے گا، گفتگو بے معنی ہو جائے گی۔ اور اگر کوئی معنی ہوئے بھی، تو وہ کہنے والے کے مقصد و منشاء کے برعکس ہوں گے۔ اب انسان کی ایک دن کی کہی ہوئی باتوں میں زمانی ترتیب کو نظر انداز کر دیا جائے، تو نہ ربط رہے نہ معنی رہے، ادھر ۲۳ سال میں نازل ہونے والی کتاب، اور وہ بھی دو دو، چار چار جملوں کی صورت میں، ہر آیت کا محل نزول دوسری سے مختلف، ہر ایک کی شانِ نزول جداگانہ، اور اسے وقت، جگہ، موضوع، مخاطب، غرض کسی بھی ترتیبی بنیاد کے بغیر جمع کر دیا جائے اور پھر کلام میں ربط بھی رہے، معنی و مفہوم میں تغیر نہ پیدا ہو۔ واقعہ، نظریہ، عقیدہ، حکم، سرزنش، تعریف، تحریک، تادیب غرض کوئی بات ایسی نہ ہو جو کہنے والے کے مقصود سے مختلف ہو، یا جس سے کہی گئی کسی بات کی نفی ہو جائے۔ تو یہ اسی وقت ممکن ہے جب ۲۳ سال میں نازل ہونے والی کتاب کا ہر ارشاد دوسرے سے گہری مطابقت رکھتا ہو، جب کتاب کا ہر جملہ باقی کتاب کے اجزاء سے اتنا گہرا ربط رکھتا ہو کہ کسی جزو کو دوسرے کسی جزو کے ساتھ رکھ دیں تو دونوں اجزاء پکار پکار کر کہیں کہ ہم ایک چمن ہی کے نہیں، ایک ہی شاخ کے دو پھول ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تیسرا معجزہ توارث صفات تھا۔ کردارِ رسالتؐ کے بارہ نمونے یکے بعد دیگرے دنیا میں آئے۔ سب کے سب مسند امامت پر ایک دوسرے کے جانشین، ایک دوسرے کے وارث، لیکن ایسے وارث، ایسے جانشین کہ دنیا میں کسی کی نیابت کے لئے جتنے بھی الفاظ بولے جاتے تھے، ان میں سے کوئی بھی لفظ جب ان حضرات کے لئے بولا گیا تو معنی و مفہوم میں اضافہ کرنا پڑا۔ بات کی وضاحت کر دوں۔ وارث بادشاہوں کے، صاحبان تخت و تاج کے بھی ہوتے ہیں۔ سجادہ نشین اہل خانقاہ کے بھی ہوتے ہیں اور جانشین صاحبانِ منبر و مدرسہ کے بھی ہوتے ہیں۔ لیکن صرف ان

معنوں میں کہ مورث کے بعد وارث بادشاہ کہلائے گا، حکمران تسلیم کیا جائے گا۔ پیر کے بعد سجادہ نشین پیر ہوگا، اس کی ہاتھ پر بیعت ہوگی۔ استاد کی جگہ لینے والا بھی استاد کہلائے گا، درس و تدریس کا کام کرے گا، بس وراثت کے معنی ختم۔ اب وارث، مورث کے پورے نظام کو بدل دے، اس کے تمام قاعدے قوانین منسوخ کر دے، اس کے تمام کارکنوں کو برطرف کر دے، مورث کے عہد کی اچھائیاں برائی بن جائیں، مورث کی ناپسندیدہ باتیں وارث کی نگاہ میں قابل ستائش قرار پائیں۔ غرض وارث مورث کے سیاہ کو سفید کر دے، سفید کو سیاہ کر دے، لیکن کہلائے گا وارث ہی۔ اس کی شخصیت یا کردار کا مکمل فرق بھی اس کو مقام وارثت سے محروم نہیں کر سکتا۔ بلکہ دنیا نے اس فرق کے سامنے یوں ہتھیار ڈالے کہ یہ بات ذارث کا حق تسلیم کر لی گئی کہ وہ مورث کے نظام کو ضرور بدلے، چنانچہ اس اختیار کو محاورے کی شکل دے دی گئی کہ ع

ہر کہ آمد عمارت نو ساخت

یعنی وارث کا قول، عمل، اقدامات، افکار، کردار شخصیت سب بالکل مختلف ہوتے ہیں لیکن یہ اختلاف اس کے وارث ہونے کی نفی نہیں کرتا۔

اب آیئے وارثانِ صفاتِ پیغمبرؐ کی طرف۔ یہ بارہ ہستیاں بھی ایک دوسرے کی جانشین۔ ان سب کا زمانہ امامت مختلف، سب کے زمانے کے سیاسی اور سماجی حالات مختلف، سب کی منصب امامت پر فائز ہونے کی عمریں مختلف، کسی کا زمانہ امامت ادھیڑ عمر یا ضعیفی میں شروع ہوا، کسی کا دورِ امامت دورِ جوانی میں شروع ہوا، کوئی اپنے بچپن میں مسند امامت پر جلوہ افروز ہوا، ان میں سے کوئی دنیا کی اصطلاح میں صاحب اقتدار تھا، کوئی اپنی تمام عمر، یا اس کا بڑا حصہ قید و بند میں گزار گیا، کسی کو زمانے کے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا، کسی کی تعظیم و تکریم میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی گئی۔ کوئی میدانِ جنگ میں نذرانۂ جان

پیش کرتا رہا، کوئی جنگ سے گریز کر کے خانہ نشینی میں عمر گزار گیا۔ گویا حالات مختلف، زمانے مختلف، کیفیات مختلف، ماحول مختلف.......... ان اختلافات کی موجودگی میں یہ بالکل یقینی تھا کہ ان سب کی شخصیتیں بھی مختلف ہوتیں، کردار بھی جدا کانہ ہوتے، اصول اور قاعدے بھی بدل جاتے۔ لیکن یہاں ہی ہمیں تاریخ انسانیت کا وہ حیران کن معجزہ نظر آتا ہے کہ حالات خواہ کتنے ہی بدلیں، سلسلۂ امامت کا ہر فرد اپنے پیش رو کے کردار کی تکرار ہے۔ ان میں سے صلح کرنے والے کا کردار، اصول اور قانون کے حوالے سے، جنگ کرنے والے کے کردار سے مختلف نہیں۔ مسند حکومت پر بیٹھنے والے کے طرزِ عمل میں، اور قید و بند کے مصائب اٹھانے والے میں فرق نہیں۔ نہ ان کے کسی قول میں اختلاف، نہ عمل میں کوئی فرق، جو ایک نے کہا وہی سب نے کہا، جو ایک نے کیا وہی سب نے کیا۔ گویا یہاں جانشینی ایک آئینہ تھی جسے ایک ہی کردار کو بارہ ناموں سے دکھانا تھا۔

ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی داخلی مطابقت، ان کے کردار کی یک رنگی ایک ایسی حقیقت ہے کہ اس کی آج تک تردید نہ کی جا سکی۔ اگر کسی نے اعتراض برائے اعتراض کیا بھی تو کردار میں تو کوئی فرق نہ دکھلا سکے، پیش آنے والے حالات و واقعات کے فرق کو کردار کا فرق قرار دے دیا۔ امام حسن علیہ السلام نے تخت سے دست برداری قبول کر لی تھی، امام حسین علیہ السلام نے میدانِ جنگ میں شہادت قبول کی تھی۔ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام حکومت سے اختلاف کے جرم میں پوری جوانی قید میں گزار دیں اور امام علی رضا علیہ السلام اسی حکومت کی ولی عہدی قبول کر لیں.......... یہ، یا اس طرح کے جتنے بھی حوالے ہیں، ان پر الگ الگ تفصیلی گفتگو درکار ہے۔ اس مرحلے پر تو صرف اس بات کی طرف توجہ دلا دینا کافی ہے کہ کردار کا تعلق عمل کے اصول سے ہے، عمل کی شکل سے نہیں۔ سردی میں اضافہ ہو تو پانی جم کر برف بن

جائے، ذرا حرارت بڑھے تو پانی بن جائے، اور گرمی بڑھے تو بخارات بن کر ہوا کے دوش پر اڑنے لگے۔ ہر مرتبہ پانی کی شکل مختلف ہے لیکن کیا پانی کی حقیقت بھی بدل گئی؟ وارثانِ کردارِ رسولؐ کے واقعات زندگی مختلف نظر آئیں تو اس واقعاتی اختلاف پر رک نہ جایئے بلکہ آگے بڑھ کر، زیادہ توجہ سے، زیادہ غور سے دیکھیئے کہ بدلتے ہوئے واقعات نے، تبدیل ہوتے ہوئے حالات نے ان کے اصول تو نہیں بدلے؟ اور اگر اصولوں میں تبدیلی نظر نہ آئے، اگر نیام میں داخل ہوتی ہوئی تلوار اور ہاتھوں میں بلند ہوتی ہوئی تلوار کا اصول ایک ہو، اگر تخت کو ٹھکراتے ہوئے قدم اور مسند اقتدار کی طرف بڑھتے ہوئے قدم کو ایک ہی قانون حرکت دے رہا ہو، تو عمل کی شکل لاکھ مختلف سہی، صاحبانِ عمل کا کردار ایک ہی ہوگا۔

اگر کسی کو اصرار ہو کہ امام حسن علیہ السلام کی اقتدار سے علیحدگی اور خانہ نشینی ایک الگ کردار ہے اور امام حسین علیہ السلام کا کربلا میں جہاد ایک جداگانہ طرزِ عمل ہے، امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام کا قائم کردہ درس و تدریس کا اجتماعی تعلقات کا سلسلہ ایک جدا کردار ہے اور امام محمد تقی، امام علی نقی اور امام حسن عسکری علیہم السلام کا عوامی رابطوں اور ملاقاتوں سے گریز ایک بالکل الگ رویہ ہے، امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا حکومت کی قید و بند میں زندگی گزار دینا کسی اور اصول کا نتیجہ تھا اور امام رضا علیہ السلام کا ولی عہدی قبول کرنا کسی اور اندازِ فکر کا ترجمان تھا.......... اگر واقعات کا مختلف ہونا، کردار کے مختلف ہونے کی دلیل سمجھا جائے تو پھر ان واقعات کا منطقی نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر زمانے کو امام حسین علیہ السلام کے اقدام پر اعتراض ہو تو امام حسن علیہ السلام کے معاہدۂ امن کے بعد ان سے رویہ دوستانہ ہونا چاہیئے تھا۔ اگر کچھ ائمہؑ کے عوامی رابطوں سے حکومتوں کو تشویش ہو تو خانہ نشین ائمہؑ کے ساتھ بہتر سلوک ہونا چاہیئے تھا۔ اگر ایک امامؑ کی مزاحمت حکمران کے لئے پریشانی کا باعث تھی تو دوسرے امامؑ

کا بادشاہ کی خواہش کا لحاظ کرتے ہوئے شریک اقتدار ہو جانا تو صاحب تخت و تاج کے لئے سکون قلب کا باعث ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ یہ افراد صلح کریں یا جنگ کریں، عوام سے رابطے بڑھائیں یا خاموشی سے گوشہ نشین ہو جائیں، اقتدار سے دور رہیں یا اس میں شامل ہو جائیں، ہر صورت میں مخالفین کا رویہ ایک ہی رہا۔ ہر امامؑ کو نشانۂ ظلم بنایا گیا۔ ہر امامؑ کو جام شہادت نوش کرنا پڑا۔ ہر امامؑ کو حکمرانوں نے اپنے راستے سے ہٹانا ضروری سمجھا۔ دشمنوں کی دشمنی کا ہر حال میں برقرار رہنا اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ حالات خواہ کتنے ہی مختلف نظر آئیں، مخالفین کی نگاہ میں ان ہستیوں کا کردار یکساں ہی تھا۔ انہیں اچھی طرح علم تھا کہ واقعات کی ظاہری شکل بدل جانے کے باوجود ان کے اصول نہیں بدلے یہ کسی حال میں بھی ہوں ان کا کردار ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہوتا۔

معجزوں کی باہمی مطابقت

اور جہاں یہ تینوں معجزے داخلی طور پر الگ الگ وحدت رکھتے تھے، وہاں ان کی باہمی مطابقت کے لئے کسی تفصیلی شہادت کی ضرورت نہیں۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تریسٹھ سالہ زندگی کا ہر لمحہ تاریخ کی نگاہوں میں ہے۔ قرآن مجید اپنی تمام جزئیات کے ساتھ ہمارے درمیان موجود ہے اور وارثانِ کردارِ رسولؐ میں اگر بارہویں کے کردار و عمل سے ابھی دنیا ناواقف بھی ہو تو باقی گیارہ کی ڈھائی سو سال کے طویل عرصہ پر محیط طرزِ زندگی سے ہم پوری طرح آگاہ ہیں...... اس پر مستزاد یہ کہ یہ تینوں معجزے اپنے ہر دور میں شدید مخالفانہ احتساب اور معاندانہ تنقید کی زد میں رہے۔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کردار کے ایک ایک جزو پر کفار گہری نظر رکھے ہوئے تھے۔ کتاب الٰہی کا

چیلنج کہ ممکن ہو تو میرا جواب لاؤ۔۔۔ ہر شخص کو کتاب کے ایک ایک لفظ پر غور و فکر کی دعوت دے رہا تھا۔ آلِ رسولؐ اپنے اپنے عہد کے فکر انسان ان کے وظیفہ خوار مؤرخوں اور عاملوں کی نگاہ کے احاطے میں تھا۔ اس کے باوجود آج تک کردارِ رسالتؐ اور وارثانِ کردارِ رسالتؐ کا کوئی ایک خفیف سے خفیف جزو نہیں جو قرآن کے کسی ارشاد سے متصادم ہو، بلکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم اور آلِ رسولؐ کی طرف نسبت دیئے جانے والے کسی قول یا کسی عمل کی نسبت کے درست یا غلط ہونے کی پہچان ہی یہ قرار پائی کہ جو قول و عمل قرآن کے مطابق ہو اسے قول و عمل رسولؐ و وارثانِ رسولؑ سمجھو ورنہ جو کچھ بھی خلافِ قرآن ہو، نہ قول و عمل رسولؐ ہو سکتا ہے، نہ ان کے جانشینوں کا طرزِ عمل ہو سکتا ہے۔

نتیجۂ کلام

گویا حضورِ اکرم ﷺ کے تینوں معجزوں کی داخلی اور باہمی مطابقت جہاں ایک طرف خود معجزانہ شان رکھتی ہے وہاں اس بات کی بھی نشاندہی کرتی ہے کہ یہ تینوں معجزے، خواہ ایک دوسرے سے الگ الگ ہوں، ان کا ظہور وقت کے مختلف لمحوں میں ہوا ہو، ان کا ماخذ، ان کا خالق، ان کو دنیا میں بھیجنے والا، ایک ہی وجود ہے۔ ایک ایسا وجود جو صرف واحد نہیں بلکہ عین وحدت ہے۔ چنانچہ اس کا ہر مظاہرہ قدرت بھی وحدت ہی وحدت ہے۔ اسی لئے تو قرآن یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ اگر تم ان معجزات کے اللہ کی طرف سے ہونے میں شک کرتے ہو تو ان کے کسی ایک جزو کا جواب لاؤ، یہ دعویٰ کرنے والا ہر اعتبار سے علیم و خبیر ہے، وہ جانتا ہے کہ وحدت کا ہر ظہور بھی وحدت ہے اور ناقص دنیا، کثرت ہی کثرت رکھنے والی دنیا جو کچھ بھی کہے یا کرے گی اس میں نقص بھی ہوگا اور کثرت کا تضاد بھی ہوگا۔

حروفِ اعجاز ۲

حروفِ مقطعات کا مطالعہ

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چار قائم و دائم معجزوں کا تذکرہ ہوا۔ کردارِ رسولؐ، قرآن، توارث کردار اور ان تینوں معجزوں کی باہمی مطابقت۔ یہ چاروں معجزے اس قدر تفصیلی موضوعات ہیں کہ صدیاں گزر گئیں، اور نہ معلوم کتنی اور صدیاں گزر جائیں گی، ان معجزوں پر گفتگو ہوتی رہی ہے اور مسلسل ہوتی رہے گی۔ عظمت رسولؐ کا کوئی تذکرہ ہو، فضائل و مصائب اہل بیتؑ کی کوئی گفتگو ہو، قرآن کے معنی اور تفسیر پر کوئی تقریر ہو یا تحریر ہو، یہ سب ان ہی معجزات کے اعتراف کا سفر ہے۔ ان میں سے ہر معجزہ، اور ہر معجزے کے تمام اجزاء، اس قدر وسعت رکھتے ہیں کہ ان کے بیان کے لئے ایک سلسلہ گفتگو کیا، کئی کئی عشرے، اور ان کی تحریر کے لئے ایک کتاب کیا، کئی کتابیں بھی ناکافی ہوں گی۔

معجزۂ قرآن کی ہمہ گیری

چنانچہ اپنے موجودہ سلسلۂ کلام کے لئے میں نے، ان چار معجزوں میں سے، صرف ایک کا انتخاب کیا ہے۔ اور وہ ہے اعجازِ قرآن۔ یعنی قرآن بطورِ معجزہ۔ لیکن میں پورے قرآن حکیم پر گفتگو نہیں کروں گا۔ میں ایسا کر بھی نہیں سکتا۔ پورے قرآن کے معجزانہ پہلو تو ہمارے حد گمان سے بھی زیادہ وسعت رکھتے ہیں۔ جو لوگ زبان و ادب کی

باریکیوں سے آگاہ ہیں، ان کے لئے قرآن کی زبان و بیان معجزہ ہے۔ جو معنی پر توجہ دیتے ہیں، ان کے لئے قرآن کے مفاہیم اور مطالب معجزہ ہیں۔ جنہیں قرآن اپنے حلقہ اثر میں لے لیتا ہے، وہ اس کی تاثیر پر حیران دششدر ہیں۔ جو زمانے کی رفتار پر نظر رکھتا ہے، اس کے لئے قرآن کی پیش گوئیاں معجزہ ہیں۔ جو تحقیق وجستجو کا متلاشی ہے، اس کے لئے قرآن کے بیان کردہ حقائق معجزہ ہیں.........غرض جیسے جیسے انسان کا مشاہدہ، انسان کا تجربہ، انسان کا علم بڑھتا جاتا ہے، قرآن کی اعجازی کیفیت کا اعتراف بھی بڑھتا جاتا ہے۔

زندہ معجزہ

اور یہاں پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات کی ایک اور منفرد خصوصیات کا ذکر کردوں۔ اور وہ یہ کہ آپ وہ واحد ہستی ہیں، جس کے معجزے، زندہ معجزے ہیں۔ زندہ معجزے ان معنوں میں کہ، انبیائے سابق کے معجزے، ان کے عہد کے لوگوں کے لئے تو حیران کن تھے، لیکن آج کا انسان ایسے اسباب فراہم کر چکا ہے، یا اتنی صلاحیت رکھتا ہے کہ اگر وہ ان انبیاء کے معجزوں کی مثال نہ بھی پیش کر سکے، تب بھی ان کی عقلی، علمی اور منطقی توجیہہ ضرور کر سکتا ہے۔ ان کے رونما ہونے کے امکانات کی تصدیق ضرور کر سکتا ہے۔

بات واقعاتی مثال سے واضح ہو جائے گی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تھا، مردوں کو زندہ کرنا۔ آج کا انسان بھی ماضی کے انسان کی طرح، کم از کم فی الحال، یقیناً یہ قدرت نہیں رکھتا کہ مردہ لاش کو دوبارہ نعمت حیات دے دے لیکن جزوی طور پر مردہ اعضائے بدن کو زندہ جسم کا حصہ بنا کر، ان میں دوبارہ زندگی کی لہر ضرور دوڑا سکتا ہے۔

اس کا ایک مردہ جزو کو زندہ کر لینا، اس امکان کی نشاندہی کرتا ہے کہ پورے مردہ وجود کا بھی دوبارہ زندہ ہو جانا ممکن ضرور ہے............ آج کا انسان، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح، اپنی بے جان لاٹھی کو نہ اژدہا بنا سکتا ہے، نہ اسے یہ خوبی عطا کر سکتا ہے کہ وہ جادوگروں کے بنائے ہوئے سانپوں کو نگل لے، لیکن آج کا انسان مادے میں موجود ایسی قوتوں سے ضرور واقف ہو چکا ہے، جو بے جان مادے کو قوت میں بدل سکتی ہیں اور چشم زدن میں پوری پوری انسانی آبادی کو معدوم بھی کر سکتی ہیں۔ یعنی آج کے انسان کا علم یہ گواہی دے رہا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ دنیائے ممکنات سے باہر نہیں ہے............ اور جب کسی مظاہرے کو دیکھ کر یہ کہا جا سکے کہ اس کی مثال پیش کرنا ممکن ہے تو وہ مظاہرہ، کمال علم کا مظاہرہ ہو جاتا ہے، کمال فن کا مظاہرہ ہو جاتا ہے، معجزہ نہیں رہ جاتا۔ چنانچہ انبیائے سابق کے معجزے، اپنی مدت حیات ختم کر چکے۔ یعنی وہ معجزے تھے، ہیں نہیں۔ اب وہ معجزے تاریخ کا حصہ ہیں، ہمارے اعتقاد کا جزو ہیں، لیکن آج کے انسان کے لئے ناقابل تردید دلیل نہیں ہیں۔

یہ نہ سمجھا جائے کہ نعوذ باللہ میں انبیاءؑ کے معجزوں کی توہین کر رہا ہوں، یا ان کے معجزہ ہونے سے انکار کر رہا ہوں............ میں صرف اس حقیقت کی طرف توجہ دلا رہا ہوں کہ ان معجزوں کی استدلالی افادیت کا ختم ہو جانا، اس بات کی شہادت ہے کہ یہ معجزے ایک خاص زمانے، اور ایک خاص گروہ انسانی کے لئے تھے۔ چونکہ ماضی کے انبیاء کا فریضۂ نبوت کسی خاص قوم کو، ایک خاص عرصہ تک، اپنی نبوت کا قائل بنانا تھا، اس لئے ان کو دلیل بھی وہ دی گئی جو صرف اسی دور کے لئے کافی ہو............ کسی دوا میں مرض کو دور کرنے کی صلاحیت ہونا اپنی جگہ، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر مریض کو اس کی پوری پوری خوراک دے دی جائے............ لائق طبیب وہی ہوگا جو ہر مریض کو دیکھ

کر، اس کے مرض کے مطابق، اس کی ضرورت کے مطابق دوا کی مقدار کا تعین کرے۔ اتنی کم دوا دینا بھی غلط ہوگا کہ مریض پر اثر ہی نہ ہو، اور اتنی زیادہ دوا دینا بھی غلط ہوگا جو مریض کی ضرورت سے بڑھ کر اس کے لئے نقصان کا باعث ہو جائے .... اللہ نے ہر نبی کو وہی معجزہ دے کر بھیجا جو اس کے دورانِ نبوت، اس کی امت کے لئے نا قابل تردید دلیل ہو۔ اور یہاں ہی سے میں اپنی بات کی طرف واپس آؤں گا کہ نبی آخرؐ کے معجزے زندہ معجزے ہیں، یعنی یہ آج بھی زمانے کو للکار رہے ہیں کہ جاؤ ہمارا جواب لاؤ، اور اس للکار کے جواب میں انسان آج بھی اپنے عجز کا اعتراف کر رہا ہے۔ یہاں ضمناً ایک جملہ کہہ دوں کہ جب تک معجزہ زندہ رہے اس وقت تک نبوت باقی رہتی ہے۔ ہمارے نبیؐ کے معجزے جب تک زندہ ہیں اس وقت تک کسی اور نبیؐ کی نہ تو ضرورت ہے، نہ آنے کا امکان ہے۔

غرض، حضورؐ کے دوسرے معجزوں کی طرح، قرآن ایک زندہ معجزہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ کتاب جیسے عرب کے خوش بیان شاعروں اور بے مثال خطیبوں کو کل حیران کر رہی تھی، ویسے ہی آج کے صاحب علم سائنس دان کو ششدر کر رہی ہے۔ جیسے کل اس کا جواب ممکن نہیں تھا، ویسے ہی آج بھی یہ کتاب لاجواب ہے۔

حروفِ اعجاز

اور جب، ہر شخص اور ہر زمانے کے لئے، قرآن حکیم میں ایک مختلف دنیائے حیرت آباد ہو، تو کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ قرآن کے تمام معجزاتی پہلوؤں کا احاطہ کر سکتا ہے۔ تو میرے لئے، اپنی علمی بے بضاعتی کے ساتھ، اپنی انتہائی محدود فکری استطاعت کے ساتھ، یہ کس طرح ممکن ہے کہ میں اعجازِ قرآن کے موضوع پر کوئی سیر

حاصل گفتگو کر سکوں۔ اس لئے میں اپنے بیان کی حدیں کم سے کم کرنے پر مجبور ہوں۔ میں پورے قرآن پر گفتگو نہیں کر سکتا۔

پورا قرآن ایک طرف، میں تو کسی ایک سورہ میں موجود غیر معمولی گوشوں کی بھی، کما حقہ، نشاندہی نہیں کر سکتا.......... بلکہ اور آگے بڑھیئے..........قرآن مجید کی ہر سورۃ متعدد جملوں پر مشتمل ہیں۔ یہ جملے آیتیں ہیں۔ آیتوں کا مطلب ہے، نشانیاں، اور ان جملوں کو ہم آیت نہیں کہتے، یہ خود قرآن نازل کرنے والے کا دیا ہوا نام ہے۔ تو جب اللہ خود قرآن کے جملوں کو اپنی نشانیاں قرار دے رہا ہو، تو اس کا مطلب ہوگا کہ صاحبِ نظر کے لئے قرآن مجید کا ہر جملہ ہر آیت اللہ کی معرفت کا ذریعہ ہے۔ ہر آیت میں وجودِ الٰہی کی دلیل موجود ہے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ اس کی ہر آیت ایک معجزہ ہے..........تو میرے لئے ان آیات پر گفتگو کرنا بھی ممکن نہیں۔

میں اعجازِ قرآن پر بات کرنا چاہتا ہوں، لیکن پورے قرآن کی بات نہیں کروں گا، اس کی کسی سورہ پر بھی بحث نہیں کروں گا، اس کی کوئی آیت بھی میرا موضوع کلام نہیں..........تو معنی ومفہوم کی دنیا تو ختم ہوگئی، اس لئے کہ کوئی بامقصد بات، کوئی بامعنی بات پوری گفتگو میں ہوگی، پوری کتاب میں ہوگی، یا پھر ایک مسلسل عبارت کے ٹکڑے کا کوئی مطلب ہوگا، اس سے آگے جملوں میں الگ الگ بھی کوئی معنی، کوئی مفہوم ہوتا ہے۔ اس سے بھی کم کوئی تحریر ہو، یا منہ سے ادا ہونے والی آواز ہو، وہ اگر گفتگو نہیں، عبارت نہیں، جملہ نہیں تو پھر محض الفاظ ہوں گے۔ اور جب جملہ الفاظ میں تقسیم ہو جاتا ہے تو ان الفاظ کے کوئی معنی نہیں ہوتے..........اگر مدرسے میں کی گئی الفاظ و معنی کی مشقیں یاد آ رہی ہوں، یا ذہنوں میں یہ خیال گردش کر رہا ہو کہ آخر ڈکشنری میں، لغت میں بھی تو الفاظ کے ہی معنی دیئے ہوتے ہیں۔ تو میں کیسے کہہ رہا ہوں کہ الفاظ کے کوئی

معنی نہیں ہوتے۔ تو میں گرامر کی کسی بحث میں الجھے بغیر اپنے الفاظ کو بدل کر یوں کہوں گا کہ سمجھنے اور غور کرنے کی چیز کسی کی کہی ہوئی کوئی ''بات'' ہوتی ہے، اور بات کی کم سے کم صورت جملہ ہے، جس سے کم یعنی محض الفاظ بات نہیں کہلائیں گے۔ تو جسے حسن بیان کا کوئی مظاہرہ کرنا ہے، یا کسی کو بیان میں موجود حیرت انگیز کمالات کا جائزہ لینا ہے تو اسے کم از کم جملوں پر نظر ڈالنی ہوگی، محض الگ الگ الفاظ اس کے کسی کام نہیں آئیں گے..........

اور الفاظ کے بعد وہ آخری جزو آتا ہے جسے حرف کہتے ہیں۔ لفظوں کو بے معنی کہنے پر ممکن ہے آپ مجھ سے اتفاق نہ کرتے۔ لیکن جب بات حرف کی ہو تو ان کو بے معنی کہنے پر شاید کسی کو اعتراض نہ ہو۔ اس لئے کہ حروف محض آوازیں ہیں، انسانی حلق اور منہ کی مختلف انداز سے حرکت دینے کی وہ صلاحیت ہے جس سے انسانی آواز وجود میں آتی ہے۔ انسان نے ان آوازوں کو تحریر میں ظاہر کرنے کے لئے کچھ علامتیں مقرر کر دی ہیں، یہی علامتیں حرف ہیں۔

حروفِ تہجی محض آوازیں ہیں، کسی زبان کے بامعنی الفاظ نہیں۔ اس بات کی وضاحت کے لئے یہ اشارہ کافی ہوگا کہ دنیا کی لاتعداد زبانوں میں، ہر زبان ہر اعتبار سے دوسری سے الگ ہوتی ہے۔ الفاظ الگ، جملے الگ، لہجہ الگ، طرزِ تحریر الگ، حتیٰ کہ حروفِ تہجی کے نام الگ، کوئی چیز مشترک نہیں.......... ان تمام اختلافات کے باوجود جب حروف کو یکجا کر کے لفظ بنتا ہے، تو اس لفظ میں ہر حرف کا تلفظ یا ہر حرف کی آواز ایک ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایک آواز ہے جسے ہم اردو میں ''بے'' کہتے ہیں، یہی آواز عربی زبان میں ''باء'' کہلاتی ہے، انگریزی میں ''بی'' کہا جائے گا۔ غرض کئی نام ہوں گے ایک آواز کے۔ لیکن جب اس آواز کو لفظ میں شامل کیا جائے، تو اب اس سے بحث نہیں کہ

اس کی لکھنے میں شکل کیا ہے یا اسے بصورت حرف کیا کہا جاتا ہے، اس کی آواز ہر زبان میں ایک جیسی ہوگی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حرف محض آواز ہیں۔ آواز کا ملتوبی اظہار ہیں، اور بس۔ انہیں بامعنی نہیں کہا جاتا، ان کا کوئی مفہوم نہیں، صرف حرف میں بات نہیں ہوسکتی۔

اتنی، بظاہر غیر متعلق باتوں کے بعد، اب میں اپنی گفتگو کہ حدیں عرض کر دوں۔ مجھے اعجازِ قرآن پر بات کرنی ہے۔ لیکن میں پورے قرآن پر بات نہیں کروں گا، میں اس کی کسی سورہ، کسی آیت، حتیٰ کہ کسی لفظ کی معجزانہ خصوصیات پر بھی کچھ نہیں کہوں گا۔ میرا موضوع گفتگو صرف حروف ہیں، اور حروف بھی وہ تمام نہیں، جن سے قرآن مجید کے الفاظ وجود میں آئے ہیں۔ بلکہ صرف وہ حروف جو قرآن میں محض حرف کے صورت میں آئے ہیں وہ حروف جنہیں حروفِ مقطعات کہا جاتا ہے۔ یعنی ایسے حروف جو قطع شدہ ہیں، جو ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں، جو مفرد حرف ہیں، جو آپس میں مل کر کوئی لفظ نہیں بناتے، گویا جو محض آواز ہیں.......... اور پھر مجھے اس پر بھی گفتگو نہیں کرنی کہ ان حروف سے کہنے والے کی مراد کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے معلوم ہی نہیں کہ ان سے کیا مراد ہے، یہ تو کہنے والا جانے یا پھر وہ جانیں جن سے کہا گیا ہے۔ مجھے تو صرف یہ عرض کرنا ہے کہ حروف تہجی کے یہ چند الگ الگ حروف، جب تک بچوں کے قاعدے میں ہیں، محض حرف ہیں، لیکن یہی حروف جب قرآن میں آئے تو معجزہ ہوگئے۔ یہ چند حروف اپنے دامن میں ایک عالم حیرت بسائے ہوئے ہیں.......... یہ اس قدر حیران کن ہیں کہ آج کا انسان، اپنی تمام تر علمی ترقی کے ساتھ، آج کے عہد کی انقلابی ایجاد کمپیوٹر کے ساتھ، جب ان حروف پر غور وفکر کی نظر ڈالتا ہے، تو اس کے لئے اس اعتراف کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں رہتا کہ یہ چند حرف، قرآن مجید میں جس طرح آئے ہیں، اس طرح ان کا آنا انسانی اختیار اور قوت سے باہر ہے۔

حروفِ مقطعات۔ چند بنیادی معلومات

بحث کو آگے بڑھانے سے پہلے ان حروف کے متعلق چند بنیادی معلومات کو ایک جگہ جمع کر دینا ضروری ہے تا کہ بعد میں ان حقائق کی تکرار سے بچا جا سکے۔ اور محض حوالہ دے کر بات کو آگے بڑھایا جا سکے۔

قرآن حکیم کی کل ایک سو چودہ سورتوں میں سے، انتیس سورتیں ایسی ہیں جن کا آغاز کسی لفظ کی بجائے محض حرف سے ہوا ہے۔ ان ۲۹ سوروں میں ایسے حروف مختلف تعداد میں آئے ہیں۔ کم سے کم ایک حرف ہے اور زیادہ سے زیادہ پانچ حروف ہیں۔

ان میں سے یک حرفی حروف تین ہیں: **ق، ن، ص**۔ یہ تینوں حروف مفرد طور پر، ایک ایک مرتبہ استعمال ہوئے ہیں۔ **ص** اور **ق** سورہ **ص** اور سورہ **ق** میں، اور **ن** کا حرف سورہ والقلم کا حرف آغاز ہے۔

ان کے بعد دو حرفی حروف مقطعات ہیں، ان کی تعداد چار ہے۔ **حم**، **طس**، **یس**، اور **طٰہٰ**۔ ان میں سے حم چھ سورتوں **المؤمن**، **حم السجدہ**، **الزخرف**، **الدخان**، **الجاثیہ** اور **الاحقاف** میں، اور باقی تین، تین مختلف سوروں میں ایک ایک مرتبہ آئے ہیں۔ **یس** سورہ یٰسین میں، **طہ** سورہ طہ میں اور **طس** سورہ النمل میں۔

سہ حرفی حروف مقطعات کی تعداد تین ہے: **الم**، **الر** اور **طسم**۔ یہ حروف سب سے زیادہ مرتبہ آئے۔ **الم** چھ سورتوں میں ہے، سورۃ البقرہ، آل عمران، العنکبوت، الروم، لقمان اور السجدہ میں۔ پھر **الر** پانچ سورتوں، یونس، ہود، یوسف، ابراہیم اور الحجر میں ہے۔ اور **طسم** دو سورتوں الشعراء اور القصص میں آیا ہے۔

چار حرفی حروف مقطعات کی تعداد دو ہے اور یہ دو ہی سورتوں میں ایک ایک مرتبہ آئے ہیں۔ **المر** سورۃ الرعد میں اور **المص** سورۃ الاعراف میں۔

پانچ پانچ حروف پر مشتمل حروف مقطعات دو ہیں۔ ان میں سے **کھیعص** سورہ مریم کا حرف آغاز ہے اور **حم عسق** سے سورہ شوریٰ شروع ہوتی ہے۔

ان انتیس سورتوں میں سے سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران متفقہ طور پر مدنی ہیں۔ ایک سورۃ الرعد کے متعلق مفسرین میں اختلاف ہے، کچھ کے نزدیک یہ مکہ میں نازل ہوئی اور کچھ کی رائے میں مدینہ میں۔ باقی چھبیس سوروں کے متعلق اتفاق ہے کہ یہ مکہ میں نازل ہوئیں۔

ان گزارشات کے بعد، ایک مرتبہ پھر عرض کر دوں کہ مجھے ان حروف کے معنی اور مفہوم سے بحث نہیں کرنی۔ اگر ضمناً ارشادات معصومین علیہم السلام کے حوالے سے کوئی بات کہہ دوں تو وہ سلسلہ بیان کی کوئی ضرورت ہوگی، میرا مقصود بیان نہیں۔

مطالعہ حروفِ مقطعات کا جواز

میری یہ ساری گفتگو صرف ان حروف کے معجزاتی پہلو کے حوالے سے ہے۔ میرا مقصود بیان صرف ان چند حقائق کو بیان کرنا ہے جن کی دریافت نے عقل انسانی کو قرآن حکیم کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا ہے۔ مجھے صرف یہ دکھانا ہے کہ دنیا نے ان حروف میں کیا دیکھا، اور محض عربی زبان کے چند حروف تہجی میں کون سے ایسے حیرت زدہ کر دینے والے گوشے، اب تک دریافت ہو چکے ہیں جو پورے قرآن کی صداقت کی دلیل اور اس کے کسی بالاترین ہستی کی طرف سے نازل کیئے جانے کا ثبوت بن گئے ہیں۔ لیکن حروفِ مقطعات میں موجود معجزانہ پہلوؤں کو تلاش کرنے سے پہلے، ایک اہم

سوال پر نظر ڈالنا انتہائی ضروری ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ کیا ایسی کوئی کوشش پسندیدہ بھی ہوگی؟ قرآن فہمی کے لئے اور بہت سے موضوعات میں کیا ان موضوعات میں حروف مقطعات کو شامل کرنے کی گنجائش بھی ہے؟

یہ سوال اس لئے اہم ہے کہ کم وبیش تمام مفسرین نے اس بات سے اتفاق کیا ہے کہ یہ حروف اللہ اور اس کے حبیبؐ کے درمیان ہونے والا وہ کلام ہے جس کا مفہوم اللہ جانتا ہے یا اس کا رسولؐ جانتا ہے۔ ہم اپنے طور پر ان حروف کا مفہوم نہیں جان سکتے۔

اور پھر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ حروفِ مقطعات، قرآن حکیم کا وہ جزو ہیں، جسے، قرآن ہی کی اصطلاح میں متشابہات کہا جاتا ہے۔ اور متشابہات قرآنی کے لئے خود قرآن مجید کا ارشاد ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۔ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ۔ وَ مَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ﴾ (سورۂ آل عمران ۳ آیت ۷)

وہ ذات ہے جس نے تم پر یہ کتاب نازل کی اس میں کچھ محکم آیات ہیں، وہی اس کتاب کی اصل ہیں، اور دوسری متشابہات ہیں۔ پس وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ہے، وہ فتنہ چاہنے اور مفہوم قرآن کو اپنے مطلب پر ڈھالنے کے لئے، ان متشابہہ آیات کی پیروی کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کا مطلب اللہ، اور ان

کے علاوہ جو علم میں راسخ ہیں، اور کوئی نہیں جانتا۔

تو کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم حروفِ مقطعات پر گفتگو کر کے، اللہ اور رسولؐ کے درمیان جو بات راز تھی، جسے آشکارہ کرنا مناسب ہوتا تو اس اشاراتی اندازِ بیان کی ضرورت ہی نہ پڑتی، ہم اس راز کی جستجو کے مجرم تو نہیں بن رہے؟ جس بات کو ہم سے پوشیدہ رکھا گیا اس کی کھوج میں راہِ مستقیم سے تو نہیں ہٹ رہے؟......... پھر جب متشابہات میں الجھنے والے دل کی کجی کا شکار ہیں؟ تو حروفِ مقطعات پر غور وفکر یا ان پر گفتگو سے ہم کہیں کج دلوں کی جماعت میں تو شامل نہیں ہو جائیں گے؟

ان اندیشوں کے بارے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر حروفِ مقطعات کے بارے میں غور وفکر کرنا غلط ہوتا، جرم ہوتا تو ان حروف کو جزوِ قرآن ہی کیوں بنایا جاتا اس لئے کہ قرآن کے اپنے ارشاد کے مطابق:

﴿اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا﴾

(سورۂ محمدؐ ۴۷، آیت ۲۴)

یہ قرآن پر غور کیوں نہیں کرتے کیا ان کے دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں۔

تو جب یہ حروف جزوِ قرآن ہیں تو ان پر غور کرنا عین منشائے قرآن کے مطابق ہوگا۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ یہ حروف خدا اور رسولؐ کے درمیان راز کی حیثیت رکھتے ہیں تو اس بات کی سچائی میں کوئی شک نہیں۔ لیکن سوال یہ کہ جو بات اس قدر رازداری سے کہی گئی تھی، اس کے اشاروں کو ہمارے درمیان رکھنے کی ضرورت کیا تھی؟ اللہ نے اپنے حبیب کو ایک پیغام دیا اور مصلحت خداوندی یہی تھی کہ ہم اس سے بے خبر رہیں تو اللہ نے جو کہنا تھا کہہ دیا، حضورؐ پیغام کی حقیقت سے آگاہ ہو گئے۔ اب اگر

بات کا مقصد پورا ہوگیا تھا تو ان اشاراتی حروف کو اس کتاب کا جزو بنانے کی کیا ضرورت تھی جو صرف ہماری ہدایت کے لئے ہے۔

اور اگر مزید غور کیجیے تو اس صورتِ حال کا نتیجہ برعکس نکلے گا۔ اللہ نے جو کچھ بھی اپنے رسولؐ پر نازل کیا وہ ہم تک اسی وقت پہنچا جب اللہ کے حبیبؐ نے ہمیں بتایا۔ یہ کہنے کے لئے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں کہ وحی کی ایک قسم وہ بھی تھی جو حضورؐ پر تو نازل ہوئی لیکن قرآن میں شامل نہیں کی گئی قرآن کی بہت سی آیتوں کی سند رہنے دیجیے، صرف یہ دیکھ لیجیے کہ ہم جو نماز پڑھتے ہیں یہ اللہ کے رسولؐ نے خود وضع کی تھی یا اللہ نے ارشاد کیا تھا؟ ظاہر ہے کہ ہر مسلمان کا عقیدہ ہے کہ اسلام کے تمام احکام، اور ان احکام پر عمل کرنے کے تمام طریقے اللہ ہی کی طرف سے آئے ہیں۔ تو یہ نماز قرآن میں کہاں ہے؟ ظاہر ہے کہ جس وحی کے ذریعہ طریقۂ نماز تعلیم کیا گیا تھا، مصلحت الٰہی یہی تھی کہ وہ وحی جزوِ قرآن نہ بنے بلکہ جزوِ کردارِ رسولؐ بنے۔ اب اگر کوئی خاص بات ایسی تھی جو صرف حضورؐ کے لئے تھی تو کسی اشاراتی زبان کی ضرورت ہی نہیں تھی، اللہ کو جو کچھ کہنا تھا صاف لفظوں میں اپنے حبیبؐ سے کہہ دیتا اور اس کے بعد یہ ارشاد بھی فرما دیتا کہ یہ بات کسی کو معلوم نہ ہو۔ لیکن پیغام کو پہلے تو اشارات کی صورت میں بھیجنا اور پھر ان اشارات کو قرآن میں شامل کرانا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ، جو پیغام حضورؐ کے لئے تھا وہ تو ان تک پہنچ گیا لیکن ان حروف میں ہمارے لئے، نوعِ انسانی کے لئے، بھی کوئی نہ کوئی پیغام ضرور ہے۔ کوئی نہ کوئی ہدایت ہمارے لئے بھی ضرور ہے۔

ضروری نہیں .... بلکہ یقیناً ایسا نہیں کہ ہم ان حروف پر غور کریں اور کسی نتیجے تک پہنچیں تو یہ وہی پیغام ہو جو آنحضورؐ کو دیا گیا تھا۔ لیکن یہ تو ممکن ہے کہ ہم غور کریں تو اس بات کو سمجھنے میں کامیاب ہو جائیں جو ان حروف کو قرآن میں رکھنے کی مصلحت

بنی.......... کسی بھی بڑی بات کے ایک سے زیادہ پہلو ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ پہلو صرف خواص کے لئے مخصوص ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے کئی پہلو ایسے بھی ہوتے ہیں جن سے عوام بھی آگاہ ہو جاتے ہیں۔ اور بعض اوقات تو ان پہلوؤں سے عوام کا آگاہ ہونا بات کہنے والے کا مقصود بھی ہوتا ہے۔

ایک حاکم، بھرے مجمع میں، اپنے کسی ماتحت کو اپنے قریب بلائے اور اس سے سرگوشی میں کوئی بات کہے تو مجمع کے دوسرے افراد، ظاہر ہے کہ، اس بات سے بے خبر رہیں گے جو کہی گئی۔ لیکن مجمع عام میں یہ سرگوشی اس لئے بھی ہو سکتی ہے کہ دیکھنے والے، حاکم کی نظر میں اپنے خاص ماتحت کا مقام پہچانیں، سمجھ جائیں کہ یہ اہلکار حاکم کا معتمد ہے، بھروسے کا آدمی ہے.......... اور اگر دورانِ سرگوشی، حاکم مجمع میں موجود کسی شخص کی طرف اشارہ بھی کرے، تو کیا مجمع کو یہ سمجھنے سے روک دیا جائے گا کہ ضرور یہ سرگوشی اس شخص کے متعلق ہے جس کی طرف اشارہ کیا گیا تھا.......... اور اگر، جس کی طرف اشارہ کیا گیا تھا، اس نے حاکم کو اپنی کسی حاجت کے بارے میں درخواست دی تھی تو اس اشارے اور سرگوشی سے وہ یہ نتیجہ نکالے کہ ضرور میرا مسئلہ زیر بحث ہے، کیا ایسا سمجھنے والا سرکاری راز کو جاننے کا مجرم ہوگا؟ اور مجمع عام میں سائل کی طرف اشارہ کر کے ماتحت سے کچھ کہنا، اصل حکم کے علاوہ جو ماتحت کو دیا گیا ہے، کیا سائل کے لئے یہ پیغام نہیں رکھتا کہ تم مطمئن ہو جاؤ، تمہاری درخواست پر کارروائی ہو رہی ہے؟

حروفِ مقطعات یقیناً متشابہات قرآن میں سے ہیں۔ اور متشابہات بھی ایسے کہ جو بالکل ذاتی اصطلاحات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یعنی دیگر متشابہ آیات کے بہ اعتبار لغت و زبان، کچھ نہ کچھ معنی لئے جا سکتے ہیں، لیکن دنیا کی کوئی لغت، کوئی عربی زبان کا ماہر، کوئی ادیب، کوئی شاعر، کوئی مفسر ان حروف کے معنی نہیں بتا سکتا، اور نہ کسی کو حق

حاصل ہے کہ وہ ان حروف کے کوئی معنی اپنے طور پر معین کرے۔ خود قرآن حکیم نے یہ کہہ کر کہ متشابہات کی تاویل سے اللہ واقف ہے یا پھر راسخون فی العلم واقف ہیں، یہ پابندی لگا دی ہے کہ ایسی آیات کی تاویل نص کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ یہ نص قرآن مجید کی محکم آیات ہوں، ارشادِ رسالتؐ ہو یا راسخون فی العلم کا فرمان ہو۔ ان نصوص کے بغیر متشابہہ آیات کی تاویل کرنا دل کی کجی اور فتنہ انگیزی کی علامت ہوگا۔ لیکن یہ پابندی صرف آیات کی تاویل و تفسیر پر ہے اور تاویل اور تفسیر کا تمام تر تعلق معنی سے ہے، کلامِ الٰہی کی مراد سے ہے۔ اگر معنی اور مراد سے ہٹ کر، کسی اور زاویہ سے، کسی اور حوالے سے، کسی بھی جزوِ قرآن کا جائزہ لیا جائے، خواہ وہ جزوِ محکم ہو، متشابہہ ہو، یا حروفِ مقطعات کی طرح ''متشابہہ مطلق'' ہو، ایسی تحقیق یا جائزہ پر نہ قرآن پابندی لگاتا ہے نہ عقل وخرد کی طرف سے کوئی قدغن ہے۔

بات کی وضاحت کر دوں۔ اگر کوئی صاحب نظر، اپنے علم وفن کے حوالے سے قرآن کے کسی جزو کی کسی غیر معمولی خصوصیت کا پتہ چلاتا ہے، یا اس کی کسی خوبی کو دریافت کرتا ہے، مثلاً صرف ونحو کا کوئی عالم قرآن میں گرائمر کے قواعد کی باقاعدگی کا جائزہ لیتا ہے، ادب کا کوئی نقاد کسی آیت میں صنائع و بدائع کی نشاندہی کرتا ہے، کوئی ریاضی دان آیاتِ قرآنی میں اعداد کے توازن اور ربط کا پتہ چلاتا ہے، کوئی سائنس دان عہد جدید کی تحقیقات کو کلام الٰہی کی تصدیق کے طور پر پیش کرتا ہے، کوئی مورخ قرآن کے بیان کردہ کسی اجمالی واقعہ کی تفصیل بیان کرتا ہے تو اس قسم کی تمام کوششیں مستحسن ہوں گی اور خدمت قرآن کا درجہ رکھیں گی، بشرطیکہ ان کی بات عقل اور منطق کے مسلمہ قواعد پر پوری اترتی ہو، جس علم کے حوالے سے بات کی گئی ہو، خود اس علم کے مقرر کردہ معیار سے مطابقت رکھتی ہو، اور سب سے اہم بات، کہ ایسی کوئی تحقیق نہ تو قرآن کے

مسلمات سے ٹکراتی ہو، نہ مفہوم قرآن کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش ہو۔

حروفِ مقطعات یقیناً خدا اور رسولؐ کے درمیان راز ہیں۔ لیکن ان حروف کو قرآن میں رکھے جانے کی مصلحت یہی نظر آتی ہے کہ قرآن کا قاری ان حروف پر غور کرے۔ ان اشاروں میں جو پیغام اس کے لئے ہے، اس کو سمجھے، بے ادبی اور گستاخی، بلکہ جرم یہ ہوگا کہ ہم ان حروف کے کوئی معنی متعین کریں اور پھر دعویٰ کریں کہ جو کچھ ہم نے سمجھا ہے وہی منشائے خدا ہے، وہی پیغام ہے جو اللہ نے اپنے رسولؐ کو دیا تھا۔ ایسا دعویٰ کرنا عقلاً بڑی حماقت ہوگی اور شرعاً گناہ عظیم ہوگا۔ لیکن حروف کے اصل مقصود، اور حقیقی معنی سے قطع نظر، اگر قرائن سے، شواہد سے، زبان و بیان کے کسی حوالے سے، اعداد وشمار کی شہادت سے، سیاق وسباق پر غور کرنے سے اگر کچھ اور منطقی اور عقلی نتائج سامنے آئیں تو ایسے نتائج تک پہنچنے کی کوشش سے لے کر کامیابی تک کے تمام مراحل پسندیدہ بھی ہوں گے اور مقصد نزول قرآن کے حصول کا ذریعہ بھی ہوں گے۔

مطالعۂ حروف کے خلاف ایک اور نقطۂ نظر

حروفِ مقطعات پر غور وفکر کے سلسلے میں ابھی تک وہ اندیشے زیرِ بحث تھے جو عظمت قرآن کے احساس سے پیدا ہوئے تھے۔ جن کی بنیاد یہ خیال تھا کہ ہم اپنی عقل اور علم کی بے بضاعتی اور تہی دامانی سے واقف تھے، اور اسے جسارت سمجھتے تھے، اپنی حدود سے تجاوز سمجھتے تھے کہ اللہ کے کلام کے ان سربستہ رازوں کو سمجھنے کے لئے قدم بڑھائیں.......... اور پھر ہمیں یہ اندیشہ پریشان کر رہا تھا کہ کہیں ان حروف پر غور وفکر کرنا، گستاخی نہ ہو، موجب ناراضگی خدا ورسولؐ نہ ہو، حکم قرآن کی خلاف ورزی نہ ہو۔ ہمارے یہ تمام اندیشے غلط سہی، ہماری غلط فہمی کا نتیجہ سہی، لیکن، بہر طور بدنیتی پر نہیں،

خلوص پر مبنی تھے۔ یہ اندیشے عظمت قرآن کا اقرار تھے، اپنی نارسائی اور بے بضاعتی کا اعتراف تھے......... لیکن ہمیں ان حروف قرآن پر غور وفکر سے روکنے کا ایک اور سبب بھی بتایا گیا، اور وہ یہ کہ ان حروف پر غور اس لئے نہ کرو کہ ایسا کرنا بیکار ہوگا، بے فائدہ ہوگا، کیوں؟ اس لئے کہ ان حروف میں غور کرنے والی کوئی بات ہے ہی نہیں۔

قرآن مجید کے متعلق ایسی کوئی رائے دینا غیر معمولی جسارت کا مظاہرہ ہے ہو سکتا ہے مجھے کہنے والے کا موقف سمجھنے میں غلطی ہو رہی ہو، اس لئے اس نقطۂ نظر کے علمبردار، ایک بہت بڑے عالم کے الفاظ نقل کر دوں.

''جس زمانے میں قرآن نازل ہوا اس دور کے اسالیب بیان میں اس طرح کے حروف مقطعات کا استعمال عام طور پر معروف تھا......... بعد میں یہ اسلوب عربی زبان میں متروک ہوتا چلا گیا۔ اور اس بنا پر مفسرین کے لئے ان کے معنی متعین کرنا مشکل ہو گیا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ نہ تو ان حروف کے سمجھنے پر قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کا انحصار ہے، اور نہ یہی بات ہے کہ اگر کوئی شخص ان کے معنی نہ جانے گا تو اس کے راہ راست پانے میں کوئی نقص رہ جائے گا۔ لہٰذا ایک عام ناظر کے لئے کچھ ضروری نہیں ہے کہ وہ ان کی تحقیق میں سرگرداں ہو'' (سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ تفہیم القرآن، جلد اول، صفحہ ۴۹)

کسی عام مسلمان ہی کی طرف سے نہیں، دنیائے اسلام کے ایک نامور عالم کی طرف سے، اور عالم بھی وہ جو ایک طرف جدید دنیا کے سامنے اسلام کا وکیل ہونے کا دعویدار ہو، دوسری طرف اس کو قرآن حکیم کی تشریح و توضیح کے ساتھ اس کے دشوار

مقامات کی تفہیم کا بھی ادعا ہو، اس کی زبان سے ان جملوں کا ادا ہونا انتہائی خوفناک نتائج کی طرف لے جاتا ہے۔ اور اگر ان جملوں کے لئے نرم سے نرم الفاظ بھی استعمال کئے جائیں تو یہ ایک خطرناک حد تک غیر محتاط بیان ہے۔

قرآن حکیم کو مکمل طور پر کلامِ الٰہی ماننے کے بعد، اس کتاب کو قیامت تک نوعِ انسان کے لئے کتابِ ہدایت تسلیم کرنے کے بعد، اور اس کو ایک قائم و دائم معجزہ سمجھنے کے بعد اگر یہ کہا جائے کہ اس کا کوئی جزو، زبان کے اسلوب کے متروک ہو جانے کی وجہ سے، آج خود بھی متروک ہو چکا ہے، یہ کہنے کے مترادف ہے کہ نعوذ باللہ قرآن کو نازل کرنے والی ذات آئندہ زمانے کی رفتار سے بے خبر تھی۔ اور اگر آج ایک جزو متروک ہوا ہے تو دشمنانِ قرآن امید رکھیں کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، عربی زبان میں اور تبدیلیاں آئیں گی اور باقی قرآن بھی متروک اور ناقابل فہم ہو جائے گا۔ اور اگر وقت کی رفتار قرآن پر اسی طرح اثر انداز ہو رہی ہے تو آج اس کی زبان اور اسلوب متروک ہوا ہے، کل اس کے احکام اور فرامین بھی متروک ہو سکتے ہیں۔

اگر یہ الفاظ کسی غیر مسلم کے ہوتے تو جواب کسی اور طرح سے دیا جاتا لیکن کسی دعویٰ علم رکھنے والے مسلمان کے لئے قرآن حکیم کا یہ حوالہ ہی کافی ہونا چاہیئے کہ قرآن مجید نے کائنات کی بہت سی اشیاء اور کیفیات کو اللہ کی نشانیاں قرار دیا ہے۔ لیکن پورے قرآن میں صرف حروفِ مقطعات ہیں جن کو، ایک مرتبہ نہیں، آٹھ مرتبہ آیات کتاب قرار دیا ہے۔ کیا یہ توجہ کو اپنی جانب مبذول کرانے والی بات نہیں کہ اللہ کی معرفت کے لئے تو آفاق و انفس میں بے شمار نشانیاں ہوں، لیکن اللہ کی کتاب کے لئے صرف حروفِ مقطعات کو ذریعہ معرفت قرار دیا جائے اور ہم ان حروف کے لئے یہ کہہ دیں کہ "ایک عام ناظر کے لئے کچھ ضروری نہیں کہ ان کی تحقیق میں سرگرداں ہو"

چلیے اگر ایک عام ناظر ان حروف میں سرگردانی کی اہلیت نہیں رکھتا تو وہ جو قرآن کا معلم ہے اور اللہ کی کتاب ن تر..ی کا دعویدار ہے کیا، اس کے لئے بھی یہ سرگردانی، سرگرانی کا سبب ہونی چاہیئے؟ چھ ...ون کی ضخیم تفسیر قرآن میں، ۲۹ مقامات پر آنے والے حروف کے متعلق محض ایک مایوسانہ پیراگراف لکھ کر اور باقی تمام مسلمانوں کو بھی ان حروف پر غور وفکر سے روک کر، کوئی قرآن کی خدمت کر رہا ہوگا یا عظمت قرآن کو گھٹانے کا سامان کر رہا ہوگا، یہ فیصلہ صاحبانِ نظر ہی فرما سکتے ہیں۔

میرے پیش نظر صاحب تفہیم کے جملوں کے اعتقادی پہلو پر بحث کرنا نہیں، اور نہ ان جملوں کی بنیاد پر کہنے والے کے تصور قرآن کا جائزہ لینا ہے یہ میرا منصب نہیں۔ مجھے تو صرف اس نقطۂ نظر کا، معروضی طور پر تجزیہ کرنا ہے کہ ''امتدادِ زمانہ سے حروف مقطعات، ایک متروک اسلوب میں کہی ہوئی بات ہونے کی وجہ سے اپنے معنی و مفہوم کو کھو چکے ہیں، اس لئے اب ان پر غور وفکر کرنا بے نتیجہ ہوگا۔''

تو اپنی حدود میں رہتے ہوئے، پہلی بات تو یہ ہے کہ تاریخی طور ہمیں کوئی سند نہیں ملتی کہ اس طرح کا کوئی اسلوب، کبھی عربی زبان میں رائج تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عرب شعراء، بعض اوقات مجاز مرسل کے طور پر، یا تشبیہ کے لئے، حروفِ تہجی میں سے کسی حرف کو، کسی لفظ، خیال یا کیفیت کے اظہار کے لئے استعمال کرتے تھے، اس کی مثال ہمیں اردو میں بھی مل جاتی ہے، جیسے اس شعر میں حرف لام کا استعمال:

ل نستعلیق کا ہے اس بت کافر کی زلف
ہم تو کافر ہوں اگر بندے نہ ہوں اس لام کے

زبان و بیان کا ہر صاحب ذوق بہ آسانی یہ دیکھ سکتا ہے کہ حروفِ تہجی کے اس طرح استعمال میں اور قرآن کے حروفِ مقطعات کے استعمال میں سوائے مقطع حروف کے کوئی

چیز مشترک نہیں۔ بقول علامہ ابوالفداء عماد الدین ابن کثیر:

''ان اشعار میں خود عبارت ایسی ہوتی ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے۔ ایک حرف کے بولتے ہی پورا لفظ یا کلمہ سمجھ میں آجاتا ہے۔ لیکن قرآن میں حروفِ مقطعات اس طرح نہیں آئے۔''

(تفسیر ابن کثیر، جلد اول، الم کی تفسیر کے ذیل میں)

گویا اس طرح حروفِ مقطعات کا استعمال، جیسے قرآن حکیم میں ہے، اس سے کوئی اسلوب نہیں تھا۔ اور جب قرآن کے حروفِ مقطعات بغیر کسی سابقہ نظیر کے پہلی مرتبہ اس انداز میں استعمال ہوئے ہیں تو کسی اسلوب کے متروک ہو جانے، یا باقی رہنے سے قرآن پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔

حروفِ مقطعات کو عربوں کے ایک سابقہ اسلوب کی پیروی ثابت کرنے کے لئے جو ایک دلیل دی گئی ہے وہ بھی کوئی حتمی حیثیت نہیں رکھتی۔ دلیل یہ ہے کہ:

''یہ مقطعات کوئی چیستان نہ تھے جس کو بولنے والے کے سوا کوئی نہ سمجھتا ہو، بلکہ سامعین بالعموم جانتے تھے کہ ان سے کیا مراد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کے خلاف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عصر مخالفین میں سے کسی نے بھی یہ اعتراض کبھی نہیں کیا کہ یہ بے معنی حروف کیسے ہیں جو تم بعض سورتوں کی ابتداء میں بولتے ہو۔ اور یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ سے بھی ایسی کوئی روایت منقول نہیں ہے کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے معنی پوچھے ہوں۔''

(تفہیم القرآن، جلد اول، صفحہ ۴۹)

اگر ان الفاظ کو کسی نے اعتراض [illegible] کا موضوع نہیں بنایا تو ایسا اس لئے تھا

کہ ان گنتی کے چند حروف کو بے معنی وہ کہتا جو باقی ماندہ قرآن حکیم سے ناواقف ہوتا۔
جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہم عصر مخالفین قرآن کی بے پناہ معنویت اور حسن بیان سے پوری طرح آگاہ تھے۔ اور اس کلام کو کبھی شاعری کہتے، کبھی جادو قرار دیتے، کبھی اعتراف کرتے کہ یہ کلام بشر نہیں ہوسکتا۔ تو اگر اس میں کوئی لفظ یا حرف ان کی سمجھ میں نہ آتا تو اس کا فطری نتیجہ یہی ہونا چاہیئے تھا کہ وہ ان حروف کو بے معنی سمجھنے کی بجائے، ان کے معنی تلاش کرتے، یا پھر اپنی بے بسی کا اعتراف کر لیتے۔ اور جب یہ دونوں باتیں نہ ہوسکیں تو سوائے خاموشی کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ کوئی بات سن کر سوال نہ کرنا، بات کو سمجھ جانے کی دلیل قرار دینا بالکل خلاف واقعہ ہے۔ بار ہا نہ سمجھتے ہوئے بھی سوال اس لئے نہیں کیا جاتا کہ کہنے والے کی عظمت و بزرگی کا رعب مانع ہو جاتا ہے۔ کبھی نہ سمجھتے ہوئے بھی سوال اس لئے نہیں کیا جاتا کہ سوال کرنے والا اپنی بے بسی اور لاعلمی کے ظاہر ہو جانے سے خوف زدہ ہوتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مخالفین کا، حروف مقطعات کو نہ سمجھنے کے بعد بھی، انہیں بے معنی نہ کہنا اس لئے تھا کہ وہ عربی زبان پر اپنی تمام تر قادر الکلامی کے باوجود یہ دیکھ رہے تھے کہ قرآن جس طرح بات کہتا ہے، اور جو بات کہتا ہے، اس کا جواب دینا ان کے لئے ممکن نہیں ہے۔ یہ تو وہ کبھی گمان کر ہی نہیں سکتے تھے کہ قرآن کے نام سے پیش کیا جانے والا حیرت انگیز کلام، بے معنی بھی ہوسکتا ہے۔ انہوں نے پہلے کبھی اس کلام میں معنی و مفہوم کی کوئی کمزوری دیکھی ہوتی تو حروف مقطعات پر زبان کھولنے کی جسارت کرتے۔ وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ قرآن جس پائے کا کلام ہے، ایسے کلام کے کسی جزو کو بے معنی کہنا، اپنی جہالت کا اعتراف تو ہوسکتا ہے، قرآن کی عظمت کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

اور پھر اس دعویٰ کو قبول کرنے کی بھی کوئی گنجائش نہیں کہ عہد رسالتؐ کے لوگ

جانتے تھے کہ ان حروف سے کیا مراد ہے۔ ماضی کے حوالے تو ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ آج تک کبھی، کسی نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ حروف مقطعات کو سمجھتا ہے۔ اگر یہ حروف کسی رائج اسلوب کے مطابق ہوتے تو سب سے پہلے صحابہ کرامؓ کے لئے قابل فہم ہوتے۔ لیکن انہوں نے حضورؐ سے ان حروف کے متعلق سوال کیا ہو یا نہ کیا ہو، متعدد حوالوں سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ وہ ان کے معنی سے بالکل ناآشنا تھے۔ بعض صحابہ کرام کی طرف سے حروفِ مقطعات کی قیاسی تاویلیں اس بات کی واضح شہادت ہے کہ وہ، اس بارے میں، آج کے مسلمانوں سے زیادہ باخبری کے مقام پر نہیں تھے۔ ایک ابن کثیر ہی کو دیکھ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ عبداللہ ابن عباس کے خیال میں ان میں سے بعض حروف اللہ کا نام ہیں، عکرمہ کہتے ہیں کہ ان حروف میں درحقیقت قسمیں کھائی گئی ہیں۔ سعید ابن جبیر نے **ال م** کا مطلب **انا اللّٰہ اعلم** قیاس کیا۔ عبداللہ ابن عباس اور بعض دیگر صحابہ نے انہیں اللہ کے نام کے منتشر اجزاء قرار دیا۔ اور ایسی روایتیں بھی ملتی ہیں کہ بعض صحابہ جن میں عبداللہ ابن عباس سرفہرست ہیں، یہ کہتے تھے کہ یہ حروف اللہ کے راز ہیں اور ان کے معنی بیان کرنا درست نہیں ہے...... جب نزول قرآن کے ہم عصر لوگ ہی ان حروف کے مفہوم سے ناآشنا تھے تو اب کیسے سمجھا جائے یہ کوئی رائج اسلوب تھا اور اس زمانے کے لوگ بالعموم اس کے مفہوم سے آشنا تھے۔

اور اگر کچھ دیر کے لئے یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ انداز بیان کبھی رائج تھا اور اس عہد کے لوگ ان حروف کے معنی سمجھتے تھے، اور اب اس اسلوب کے ختم ہو جانے سے یہ حروف ناقابل فہم ہو گئے ہیں، تو کسی بھی شارح قرآن کی ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ وہ تلاش و تحقیق سے، پرانے لوگوں کی باتوں سے ان حروف کے مفاہیم حاصل کرے۔ آخر قرآن کے جس بڑے حصے کو ہم سمجھنے کے مدعی ہیں وہ بھی تو اپنے علم اور اپنی رائے سے

نہیں سمجھتے، پورے قرآن کا مفہوم بھی تو صدر اول کے مسلمانوں کے اقوال و روایات سے اخذ کیا جاتا ہے، تو اس میں کیا قباحت تھی کہ ان حروف کی تفہیم کے لئے بھی ان ہی اسلوب شناس اور فہمیدہ بزرگوں کے اقوال معلوم کئے جاتے .... آج کا محقق، پانچ ہزار سال پہلے کا ختم ہو جانے والا اسلوب ہی نہیں، بلکہ مکمل طور پر دم توڑ جانے والی مصری زبان کو بھی تلاش و جستجو کر کے دوبارہ زندہ کر لے، اور دنیائے اسلام کا ایک نامور عالم، یہ جانتا بھی ہو کہ صرف چودہ سو سال پہلے ان حروف کے معنی و مفہوم کو جاننے والے بھی "بالعموم" موجود تھے، اور یہ مانتا بھی ہو کہ تاریخ کے ذریعہ، علم رجال کے ذریعہ، علم حدیث کے ذریعہ، ان جاننے والوں سے اس کا رابطہ آج بھی قائم ہے، اور پھر وہ ان حروف پر غور و فکر سے خود بھی گریزاں ہو اور اس بارے میں، ملت اسلامیہ کے باقی افراد کی ہمت شکنی بھی کرنا ضروری سمجھے، تو اس رویہ کو انتہائی افسوسناک غیر ذمہ دارانہ سہل انگاری کے سوا اور کیا قرار دیا جائے۔

حروفِ اعجاز ۳

حروفِ اعجاز

میں پہلے ہی عرض کر چکا کہ میں ان حروف کے معنی و مطالب پر بات نہیں کروں گا۔ میں تو صرف ان حروف کے معجزانہ پہلوؤں کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ جب ہم نے ان حروف کو اللہ کا کلام مان لیا، اور اس کے ساتھ یہ بھی اعتراف کرلیا کہ ان کے حقیقی معنی تک پہنچنا نہ ہمارے اختیار میں ہے اور نہ ایسی کوشش درست ہوگی۔ تو اب ان حروف میں کسی معجزہ کی تلاش کس حد تک مفید، یا مناسب ہوگی۔ اگر کچھ کرنا ہی ہے تو زیادہ سے زیادہ ان کے نزول کے مقصد پر غور کرلیا جائے۔ اس بحث کی کیا ضرورت ہے کہ ان میں حیرت زدہ کرنے والی خصوصیات بھی تلاش کی جائیں۔

تو اس کی پہلی وجہ تو قرآن کا وہ عمومی اعلان ہے کہ اگر تم اسے خدا کی طرف سے نازل شدہ نہیں سمجھتے تو اس کا جواب لاؤ اور یقیناً تم جواب نہیں لاسکو گے۔ تو اب قرآن کے کسی جزو کو اس نقطۂ نظر سے دیکھنا کہ اس میں کون سی ایسی غیر معمولی کیفیت ہے جس کا جواب دینا ممکن نہیں، قرآن کی صداقت کی تصدیق کرنا ہوگی۔ کوئی **ب ج د** کے حروف کہہ کر دعویٰ کرتا ہے کہ یہ **ا ل م** کا جواب ہے تو اگر ہم **ا ل م** کی کسی غیر معمولی صفت سے آگاہ نہیں ہوں گے تو ہم باطل کے دعوے کو رد کیسے کرسکیں گے؟

یہ تو ہے وہ عمومی وجہ جو قرآن حکیم کے معنی و مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کے علاوہ،

اس کی ہر آیت، اور ہر لفظ کی غیر معمولی خصوصیات کو تلاش کرنے کا جواز فراہم کرتا ہے۔ لیکن ان حروف پر بطور معجزہ غور کرنے کی ایک اور وجہ ان حروف کے سیاق و سباق سے بھی سامنے آتے ہے۔

ابھی بطور مثال عرض کیا گیا کہ حاکم اگر کسی سائل کی طرف اشارہ کرے تو یہ سمجھنا درست ہوگا کہ موضوعِ گفتگو سائل کی حاجت ہے۔۔۔۔۔۔۔کیا قرآن مجید نے بھی حروف مقطعات کی سرگوشی کے دوران کوئی اشارہ کیا ہے؟ اکثر مفسرین نے خصوصیت سے نشاندہی کی کہ جہاں جہاں حروف مقطعات آئے ہیں، ان میں سے اکثر مقامات پر ان حروف کے فوراً بعد قرآن حکیم کے نزول، اس کی عظمت، اس کی صداقت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ گویا یہ حروف خاص طور پر خود قرآن حکیم کی طرف اشارہ ہیں۔

مفسرین کا یہ قیاس یقیناً قابل لحاظ ہے۔ کیونکہ ۲۹ سورتوں میں سے ۲۴ سورتیں تو ایسی ہیں کہ ان میں حروف مقطعات کے فوراً بعد قرآن مجید کے متعلق ہی کوئی بات کہی گئی ہے۔ البتہ سورۃ العنکبوت میں **ا ل م** کے بعد، سورۃ الشوریٰ میں **حم عسق** کے بعد، سورۃ والقلم میں ن کے بعد اور سورہ مریم میں کھیعص کے بعد جو تذکرے ہیں ان کا موضوع قرآن کے علاوہ کچھ اور ہے۔۔۔۔۔۔۔۲۹ مقامات میں سے براہ راست اور باقی مقامات میں سے کچھ میں بالواسطہ قرآن کے ذکر کے بعد اگر ایک دو مقامات پر کوئی اور ذکر ہو جائے تب بھی یہ نتیجہ نکالنا درست ہوگا کہ حروف مقطعات قرآن حکیم کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ لیکن دو تین مقامات کا استثنیٰ ہمارے اخذ کئے ہوئے نتیجے کا وزن کم ضرور کر دیتا ہے۔۔۔۔۔۔کیا کوئی اور موضوع مشترک ہے، جس میں کوئی استثنیٰ نہ ہو؟

آیئے ایک نظر ان تمام سورتوں کے ابتدایئے پر ڈالیں، جن میں آغاز کلام حروفِ مقطعات سے ہوا ہے:

سورۃ البقرہ۔۲

﴿الٓمّٓ o ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾

الم۔ یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک وشبہ نہیں۔

سورہ آل عمران۔۳

﴿الٓمّٓ o اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ o نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ﴾

الم۔ کوئی معبود نہیں ہے سوائے اللہ کے جو حیّ اور قیوم ہے۔ اس نے آپ پر کتاب اتاری جو حق کے ساتھ اپنے سے پہلے (کی کتابوں) کی تصدیق کرنے والی ہے۔

سورۃ الاعراف۔۷

﴿الٓمّٓصٓ o كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِىْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ﴾

المص۔ یہ کتاب آپ پر نازل کی گئی ہے، پس آپ دل تنگ نہ ہوں۔

سورۂ یونس۔۱۰

﴿الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ﴾

الر، یہ حکمت والی کتاب کی نشانیاں ہیں۔

سورہ ھود۔۱۱

﴿الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ﴾

الر، یہ ایک کتاب ہے جس کی آیتیں محکم کر دی گئی ہیں اور پھر

حکمت والے اور ہر خبر رکھنے والے کی طرف سے اسے تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔

سورۂ یوسف۔۱۲

﴿الٓر تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾

الر، یہ نشانیاں ہیں بیان کرنے والی کتاب کی۔ تحقیق ہم نے قرآن کو عربی زبان میں نازل کیا ہے تاکہ تم اسے سمجھو۔

سورۃ الرعد۔۱۳

﴿الٓمّٓرٰ. تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ . وَالَّذِیْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾

المر یہ کتاب کی آیتیں ہیں جسے آپ کے رب کی طرف سے حق نازل کیا گیا ہے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔

سورۂ ابراہیم۔۱۴

﴿الٓر. كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾

الر، یہ کتاب ہے جسے ہم نے آپ پر نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لائیں۔

سورۃ الحجر۔۱۵

﴿الٓر. تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ﴾

الر، یہ نشانیاں ہیں کتاب کی اور روشن قرآن کی۔

سورۂ مریم ۔ ۱۹

﴿کٓھٰیٰعٓصٓ ٥ ذِکْرُ رَحْمَتِ رَبِّکَ عَبْدَہٗ زَکَرِیَّا﴾

کٓھٰیٰعٓصٓ، اپنے بندے زکریا کو یاد کرنا تیرے رب کی رحمت ہے۔

سورۂ طٰہٰ ۔ ۲۰

﴿طٰہٰ ٥ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓی ٥ اِلَّا تَذْکِرَۃً لِّمَنْ یَّخْشٰی﴾

طٰہٰ، ہم نے آپ پر قرآن اس لئے نہیں نازل کیا کہ آپ زحمت اٹھائیں بلکہ (صرف اس لئے نازل کیا ہے کہ) خوفِ خدا رکھنے والے کے لئے نصیحت کا ذریعہ ہو۔

سورۃ الشعراء ۔ ۲۶

﴿طٰسٓمٓ ٥ تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ﴾

طٰسٓمٓ، یہ نشانیاں ہیں بیان کرنے والی کتاب کی۔

سورۃ النمل ۔ ۲۷

﴿طٰسٓ۔ تِلْکَ اٰیٰتُ الْقُرْاٰنِ وَ کِتَابٍ مُّبِیْنٍ﴾

طٰسٓ، یہ نشانیاں ہیں قرآن اور کتاب مبین کی۔

سورۃ القصص ۔ ۲۸

﴿طٰسٓمٓ۔ تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتَابِ الْمُبِیْنِ﴾

طٰسٓمٓ، یہ واضح کتاب کی نشانیاں ہیں۔

سورۃ العنکبوت ۔ ۲۹

﴿الٓمٓ ٥ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ

لَا یُفْتَنُوْنَ﴾

الم، کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ فقط یہ کہنے پر، کہ وہ ایمان لائے، انہیں چھوڑ دیا جائے اور ان کو آزمایا نہ جائے۔

سورۂ روم۔۳۰

﴿الٓمّٓ ٥ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ٥ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَ ھُمْ مِنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ﴾

الم، اور رومی مغلوب ہوگئے۔ بہت نزدیک کی زمین پر اور اپنے مغلوب ہونے کے بعد بہت جلد غالب ہو جائیں گے۔

سورۂ لقمان۔۳۱

﴿الٓمّٓ ٥ تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْحَکِیْمِ﴾

الم۔ یہ حکمت والی کتاب کی آیتیں ہیں۔

سورۃ السجدہ۔۳۲

﴿الٓمّٓ ٥ تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ لَا رَیْبَ فِیْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾

الم، اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کتاب رب عالمین کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔

سورہ یٰسٓ۔۳۶

﴿یٰسٓ ٥ وَالْقُرْاٰنِ الْحَکِیْمِ ٥ اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ﴾

یٰسٓ اور قسم ہے قرآن کی، آپ یقیناً اللہ کے رسولوں میں سے ہیں۔

سورہ صٓ۔۳۸

﴿صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ ٥ بَلِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ عِزَّةٍ

وَّشِقَاقٍ ٥ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ فَنَادَوْا وَّلَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ ﴿﴾

صٓ اور قسم ہے نصیحت کرنے والے قرآن کی، لیکن جو لوگ تکبر اور مخالفت میں کافر ہو گئے، ہم نے ان سے پہلے زمانوں میں کتنے ہی ہلاک کر دیئے پھر انہوں نے فریاد کی حالانکہ وہ فریاد کا وقت نہیں تھا۔

سورۃ المومن۔۴۰

﴿حٰمٓ ٥ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴾

حم، یہ کتاب غالب اور جاننے والے اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔

سورہ حم سجدہ۔۴۱

﴿حٰمٓ ٥ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾

حم، یہ رحمان اور رحیم کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔

سورۃ الشوریٰ۔۴۲

﴿حٰمٓ ٥ عٓسٓقٓ ٥ كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ﴾

حم، عسق، اسی طرح وحی کی گئی ہے آپ پر اور آپ سے پہلے لوگوں پر۔

سورۃ الزخرف۔۴۳

﴿حٰمٓ ٥ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ٥ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾

حم، اور قسم ہے بیان کرنے والی کتاب کی، ہم نے قرآن کو عربی زبان میں قرار دیا تاکہ تم سمجھ سکو۔

سورۃ الدخان۔۴۴

﴿حٰمٓ ۝ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ﴾

حم، اور قسم ہے مبین کتاب کی، ہم نے اسے مبارک رات میں نازل کیا، تحقیق کہ ہم خوف دلانے والے ہیں۔

سورۃ الجاثیہ۔۴۵

﴿حٰمٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ﴾

حم، اس کتاب کا نازل ہونا غالب اور حکمت والے اللہ کی طرف سے ہے۔

سورۃ الاحقاف۔۴۶

﴿حٰمٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ﴾

حم، اس کتاب کا نازل ہونا غالب اور حکمت والے اللہ کی طرف سے ہے۔

سورہ ق۔۵۰

﴿قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۝ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ﴾

ق اور قسم ہے قرآن بزرگ کی، ان کو تعجب ہوا کہ خوف (خدا)

دلانے والا ان ہی میں سے قرار دیا گیا، پس کافروں نے کہا یہ تو عجیب بات ہے۔

سورۃ القلم ۔ ۶۸

﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ٥ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ﴾

ن اور قسم ہے قلم کی، اور اس کی جو لکھا جاتا ہے، (اے حبیبؐ) آپ اپنے رب کی عطا سے مجنون نہیں ہیں۔

ان سورتوں کے ابتدائیوں کی، اگر مضامین کے اعتبار سے، درجہ بندی کی جائے تو صورت حال یہ ہے کہ:

۱۶ مقامات، سورہ ہائے آل عمران، اعراف، یونس، ھود، رعد، یوسف، ابراہیم، طہ، سجدہ، مومن، حم سجدہ، شوریٰ، زخرف، دخان، جاثیہ اور احقاف ایسے ہیں جہاں حروف مقطعات کے فوراً بعد یہ ارشاد ہوا ہے کہ قرآن مجید اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔

۸ مقامات، سورہ ہائے حجر، شعراء، نمل، لقمان، قصص، یونس، یوسف اور رعد میں، قرآن مجید کی کسی صفت کے بیان کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ یہ کتاب کی نشانیاں یا آیات ہیں۔ ان آٹھ میں سے آخری تین سورتوں میں نزول قرآن کا اللہ کی طرف سے ہونے کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔

۶ سورتیں یس، ص، زخرف، دخان، ق اور والقلم ایسی ہیں جن میں حروف یا حرف کے بعد کھائی جانے والی قسم بھی قرآن ہی کی ہے۔ البتہ سورہ والقلم میں پہلے قلم اور پھر، وہ جو کچھ لکھتے ہیں، یا تحریر کی قسم ہے۔ اس قسم کو بھی بہت سے مفسرین نے قرآن ہی کا مجاز بتایا ہے۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ حروف مقطعات والی سورتوں میں حروف

کے بیان کے بعد ہر جگہ قرآن ہی کی قسم کھائی گئی ہے.........اور ان قسموں والی سورتوں میں، قسم کھانے کے بعد جو مضامین بیان ہوئے ہیں، ان میں سے دو، زخرف اور دخان میں قرآن کے اللہ کی طرف سے نازل ہونے کا تذکرہ ہے، باقی چار سورتوں میں موضوع گفتگو رسالت ہے۔ تین سورتوں یس، ص اور ق میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اللہ کے رسول ہونے کی شہادت دی گئی ہے اور سورہ والقلم میں آپؐ کی عصمت کی تصدیق کی گئی ہے۔

باقی ماندہ تین سورتوں کی کیفیت یہ ہے:

سورہ مریم میں حضرت زکریا علیہ السلام کے ذکر کو اللہ کی نعمت قرار دیا گیا ہے۔

سورہ روم میں مستقبل کی ایک خبر دی گئی ہے کہ روم والے مغلوب ہوں گے۔

سورۃ العنکبوت میں مؤمنین کے اللہ کی طرف سے امتحان لئے جانے کا بیان ہے۔

اب ان موضوعات کا مزید تجزیہ کیا جائے تو:

ایک تذکرہ خدا کی طرف سے آنے والی کتاب کا ہے۔

یا پھر خدا کی طرف سے آنے والے رسول کا ہے۔

یا پھر اللہ کی طرف سے عطا ہونے والی نعمت کا ذکر ہے۔

یا پھر اللہ کی طرف سے دی جانے والی خبر کا بیان ہے۔

اور پھر اللہ کی طرف سے لیئے جانے والے امتحان سے آگاہ کیا گیا ہے۔

اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان تمام ۲۹ سورتوں میں حروفِ مقطعات کے بعد کسی نہ کسی ایسی چیز کا ذکر ہے جو اللہ کی طرف سے آئی ہے۔ اور اس قدر مشترک کے حاصل ہو جانے کے بعد سورہ بقرہ (۲۳ ویں آیت) کے اس اعلان پر ایک مرتبہ پھر نظر

ڈالیئے کہ:

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَاعَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِنْ مِثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾

اگر تمہیں اللہ کی طرف سے آنے والی کسی بات پر اس کے اللہ کی طرف سے ہونے میں کوئی شک ہے، اور تم کو دعویٰ ہے کہ تم سچے بھی ہو، تو تم، اپنے مددگاروں کو ساتھ ملا کر، اس بات کے کسی جزؤ کا جواب دینے کی کوشش کرو۔

اب یہ نتیجہ تفسیر بالرائے نہیں، بلکہ بالکل منطقی بات ہوگی کہ اللہ کی طرف سے آنے والی کسی شے کے ذکر سے پہلے، بیان کیئے گئے حروفِ مقطعات ایک دلیل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دلیل اس بات کی کہ مذکورہ شے اللہ کی بھیجی ہوئی ہے، ایک ایسی دلیل، جو ہر مخالف کو اس کا جواب دینے، اور ہر موافق کو اس پر غور کرنے کی دعوت دے رہی ہو۔ گویا حروفِ مقطعات معجزۂ قرآن میں معجزہ در معجزہ کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ہمیں ان کے اعجازی پہلوؤں کی تلاش و جستجو کرنا جائز بھی ہوگا اور صداقت قرآن کو ثابت کرنے کے لئے پسندیدہ بھی ہوگا۔

یہ بات عرض کی جا چکی کہ حروفِ مقطعات قرآن حکیم کا معجزہ ہیں، اس بات کی مزید تصدیق کے لئے میں ایک اور پہلو کی طرف توجہ دلاؤں گا۔ پہلے اس کی نشاندہی کر دی گئی ہے کہ قرآن مجید کی ۲۹ سورتوں میں سے آٹھ مقامات پر، حروفِ مقطعات کے بعد ایک جیسا جملہ کہا گیا۔

﴿تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ..........﴾

یہ اس کتاب کی آیتیں ہیں۔

اب صورتِ حال یہ ہے کہ قرآن مجید میں لفظ آیات ایک سو اڑتالیس مقامات پر آیا ہے۔ لیکن اس لفظ کا، اس صورت میں استعمال صرف گیارہ مقامات پر ہوا ہے۔ ان میں سے آٹھ مقامات تو یہی حروف مقطعات والی سورتیں ہیں، باقی تین مقامات میں سے ایک سورہ بقرہ میں، دوسرا سورہ آل عمران میں اور تیسرا سورہ جاثیہ میں ہے۔ ان تین مواقع کی کیفیت یہ ہے کہ سورۃ البقرہ کی ۲۵۱ ویں آیت میں ارشاد ہوا:

''پس (حضرت داوَدؑ کی فوج نے) اپنے دشمنوں کو مار بھگایا۔ اور داوَدؑ نے جالوت کو قتل کر دیا، اور اللہ نے اس (داوَدؑ) کو حکومت اور حکمت عطا فرمائی اور جو چاہا اسے تعلیم فرما دیا۔ اور اگر اللہ بعض آدمیوں کو بعض کے ذریعہ دفع نہ کرتا تو ضرور دنیا تباہ ہو جاتی، لیکن اللہ تمام جہانوں پر فضل کرنے والا ہے۔''

اور اس کے فوراً بعد ۲۵۲ ویں آیت شروع ہوئی:

﴿تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ﴾

اور یہ اللہ کی نشانیاں ہیں جو ہم تم پر حق کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

صاف ظاہر ہے کہ یہاں حضرت داوَدؑ کی فتح مندی، انہیں مملکت، حکمت اور علم لدنی عطا کیا جانے اور ایک گروہِ انسانی کو دوسرے کے ہاتھوں دفع کیئے جانے کو آیاتِ الٰہی قرار دیا جا رہا ہے۔

دوسرا مقام سورہ آل عمران میں ہے، یہاں آیت ۱۰۶ اور ۱۰۷ میں روزِ حشر کا ذکر ہو رہا ہے، ارشاد ہوا:

''جس دن بعض چہرے سفید ہوں گے کچھ منہ کالے ہو جائیں گے، پس وہ لوگ جن کے چہرے کالے ہو جائیں گے، (ان سے

کہا جائے گا کہ) تم اپنے ایمان کے بعد پھر کافر ہوگئے تھے پس وہ کفر جو تم کیا کرتے تھے اس کے بدلے میں، اب عذاب کا مزہ چکھو۔ اور رہے وہ لوگ جن کے چہرے سفید ہوں گے، پس وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے وہ ہمیشہ اسی میں رہنے والے ہیں۔

اور پھر ۱۰۸ ویں آیت:

﴿تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ﴾

یہاں بھی مومن و کافر پر روزِ حشر گزرنے والی کیفیت کی خبر کو اللہ اپنی نشانیاں قرار دے رہا ہے۔

اور پھر قرآن مجید کی ۴۵ ویں سورۃ الجاثیہ میں ایک مرتبہ پھر یہی ارشاد ہوا۔ پہلے دوسری آیت سے ایک ذکر شروع ہوا:

''یقیناً آسمانوں اور زمینوں میں مومنوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔ اور تمہاری اور ان جانداروں کی پیدائش میں، جن کو پھیلا دیا گیا ہے ضرور یقین کرنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں اور رات دن کے ایک دوسرے کی جگہ لینے میں، اور اس رزق میں، جسے اللہ نے آسمان سے اتارا، پھر اس کے ذریعہ، زمین کو مردہ ہونے کے بعد، زندہ کر دیا، اور ہواؤں کے پھیرنے میں یقیناً بہت نشانیاں ہیں ان کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔''

اور اس کے بعد پھر وہی ارشاد:

﴿تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ﴾

بالکل واضح ہے کہ یہاں بھی آیات اللہ ان مظاہر قدرت کو کہا جا رہا ہے جن کا

تذکرہ پہلے کی آیات میں کیا گیا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ جب اللہ تعالیٰ یہ ارشاد فرماتا ہے کہ یہ نشانیاں ہیں تو پہلے ان نشانیوں کو بیان فرماتا ہے اس کے بعد ''تلک'' کہہ کر بیان کردہ امور کو آیت قرار دیتا ہے۔ اب غور فرمائیے کہ ان تین مقامات کے علاوہ آٹھ اور موقعوں پر یہ ہی جملہ حروفِ مقطعات کے بعد آئے تو اس کے سوا اور کیا سمجھا جا سکتا ہے کہ یہاں حروفِ مقطعات کو ہی آیات قرار دیا جا رہا ہے۔

اور یہاں ضمناً بلاغت قرآنی کا حسن دیکھیے کہ جب تک قوموں کے عروج و زوال کی بات تھی، روزِ حشر رونما ہونے والے حالات کی بات تھی، مظاہر قدرت وفطرت کا تذکرہ تھا تو ان ساری نعمتوں کو اللہ کی نشانیاں ''آیات اللہ'' قرار دیا گیا، لیکن جب یہ ہی آیات کا لفظ، حروفِ مقطعات کے بعد آیا تو ہر جگہ انہیں آیاتِ کتاب کہا گیا:

﴿تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ﴾

﴿تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ﴾

﴿تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَ قُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ﴾

﴿تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ﴾

یہ فرق کیوں؟ حوادث عالم آیات اللہ کیوں اور حروفِ مقطعات آیاتِ کتاب کیوں؟........... آیت کا مطلب، نشانی، شناخت کا سبب، معرفت کا ذریعہ.......... تو اب طرزِ بیان میں اس واضح تبدیلی کی وجہ ظاہر ہوگئی۔ کائنات میں رونما ہونے والے حوادث کسی حکیم و دانا خالق کی معرفت کراتے ہیں اس لئے وہ آیاتِ الٰہی ہیں، اور حروفِ مقطعات قرآن کے کتاب اللہ ہونے کا پتہ دیتے ہیں، اس لئے وہ آیاتِ کتاب ہیں۔

اب جب کہ یہ بات پایۂ یقین تک پہنچ گئی کہ حروفِ مقطعات آیات ہیں تو ہمارے لئے ان پر غور وفکر کا نہ صرف جواز مل گیا بلکہ حکم قرآن کی رو سے ان پر غور وفکر ضروری ہوگیا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات کا ذکر کرتے ہوئے بار بار کہا ہے:

﴿لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ﴾

یہ سمجھنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ (البقرہ ۲۔۱۶۴، الرعد ۱۳۔۴، النحل ۱۶۔۱۲، روم ۳۰۔۲۴، ۲۸ الجاثیہ ۴۵۔۶۵)

﴿الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ﴾

یہ فکر کرنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ (یونس ۱۰۔۲۴، الرعد ۱۳۔۳، روم ۳۰۔۲۱، الزمر ۳۹۔۴۲، الجاثیہ ۴۵۔۱۳)

﴿لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ﴾ (یونس ۱۰۔۶۷، روم ۳۰۔۲۳)

اور صرف یہی نہیں، بلکہ ان آیات کے تذکرے کا مقصد بھی بتایا:

﴿کَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ﴾

اس طرح اللہ نے آیتوں کا بیان اس لئے کیا ہے تا کہ تم غور کرو۔

(البقرہ ۲۔۲۱۹، ۲۶۶)

﴿کَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾

اس طرح اللہ نے آیتوں کا بیان اس لئے کیا ہے کہ تم عقل سے کام لو۔ (النور ۲۴۔۶۱)

﴿قَدْ بَیَّنَّا لَكُمُ الْاٰیَاتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾

یقیناً ہم نے تمہارے لئے آیتیں اسی لئے بیان کر دیں تا کہ تم انہیں سمجھو۔ (الحدید ۵۷۔۱۷)

﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ. اَفَلَا یَسْمَعُوْنَ﴾

یقیناً اس میں بہت نشانیاں ہیں، پس کیا وہ سنتے نہیں۔

(السجدہ ۳۲_۲۶)

اب تک کی بیان کردہ تفصیلات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید میں آئے ہوئے حروفِ مقطعات، حروفِ اعجاز کی حیثیت رکھتے ہیں، یہ وہ نشانیاں ہیں جن کو دیکھ کر قرآن حکیم کے اللہ کی کتاب ہونے کا یقین حاصل ہوتا ہے اور ان پر غور وفکر کرنا، اپنی ذاتی رائے کو دخل دیئے بغیر، تفسیر و تاویل قرآن کے معیّن اور مقرر حدود میں رہتے ہوئے، ان سے کوئی منطقی اور عقلی نتیجہ اخذ کرنا، یا ان میں کسی غیر معمولی، کسی معجزانہ پہلو کا پتہ چلے تو اس کی نشاندہی کرنا، یہ سب باتیں نہ صرف یہ کہ جائز ہوں گی بلکہ ان مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہوں گی جن کے پیش نظر ان حروف کو جزوِ قرآن بنایا گیا ہے۔

حروفِ اعجاز..........۴

معجزۂ اعداد

تمہیدی، لیکن ضروری مباحث کے بعد، اب حروفِ مقطعات پر براہِ راست توجہ مرکوز کرتے ہوئے، سب سے پہلے جس زاویہ سے نظر ڈالنے کی ضرورت ہے، وہ ان حروف کی عددی اہمیت ہے۔

حروف اور اعداد، دو مختلف چیزیں ہیں۔ اور بظاہران دونوں میں کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کسی بھی کلام میں یہ دیکھنا کہ الف کا استعمال کتنی مرتبہ ہوا اور باء کا کتنی مرتبہ، بظاہر ایک بے مقصد مشق ہوگی۔ لیکن جب اس طرح حاصل ہونے والے نتائج، اپنی غیر معمولی کیفیات سے حیرت زدہ کرنے لگیں تو اس نوعیت کی مشق صاحب کلام کی عظمت اور قدرت کی تصدیق کا ذریعہ بن جائے گی۔ اور اگر یہ نتائج ایسے ہوں کہ کوئی انسان، نہ ماضی میں اس کی مثال پیش کر سکا ہو، اور نہ مستقبل میں ایسا کرنا ممکن ہو، تو پھر ایسا کلام معجزہ ہوگا اور معجزہ ذریعۂ معرفت الٰہی ہے، اس لئے اس کا مشاہدہ کرنا، اس پر غور کرنا اور نتیجہ میں قرآن حکیم کے اللہ کی طرف سے نازل کیئے جانے کی حقیقت پر، اپنے یقین میں اضافہ کرنا، ایک بامقصد، مفید اور پسندیدہ عمل ہوگا۔

لیکن آخران حروف میں اعداد ہی کا ربط دیکھنے کی اس قدر اہمیت کیوں کہ اس پر گفتگو کو باقی تمام حوالوں پر فوقیت دی جائے؟ تو اس کی بنیادی وجہ قرآن مجید ہی کا ایک فرمان ہے۔ ارشاد ہوا:

﴿اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ﴾ (سورۃ القمر ۵۴۔ ۴۹)

ہم نے ہر شے کو ایک مقدار کے مطابق پیدا کیا۔

ماضی کے انسان نے سب سے پہلے، اس مقدار کے وجود کو ان حرکات میں محسوس کیا جن کا تعلق وقت یا زمان سے تھا۔ اور جب اسے کچھ اجرامِ فلکی کی گردش اور حرکت میں، ایک مستقل اور معین دورانیہ نظر آیا تو اس نے، ان مقداروں کی بنیاد پر اپنے وقت کو دن، رات، ماہ اور سال میں تقسیم کر لیا۔ لیکن جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا گیا، اور انسان کی معلومات میں مزید اضافہ ہوا تو اسے زمان کے ساتھ ساتھ، مکان میں بھی ایک عددی تسلسل نظر آنے لگا۔ پھر اس نے اپنے وجود کی طرف دیکھا تو احساس ہوا کہ نہ صرف یہ کہ اس کے جسم کے اعضاء کی تعداد معیّن ہے بلکہ ان اعضاء کو بنانے والے اجزاء بھی ایک مقررہ مقدار رکھتے ہیں۔ جسم کی ہڈیاں ہوں، رگیں، نسیں، شریانیں، وریدیں، پٹھے، اور پھر ان تمام کو شکل اور وجود دینے والے خلیے .... یہ سب ایک مقررہ مقدار رکھتے ہیں.......... اور اس کے بعد تو ایسا لگا گویا کائنات کی تخلیق ہی اعداد سے ہوئی ہے کسی جاندار کی بات ہو یا عالم جمادات کے بے جان مادے کا تذکرہ ہو، ہر شکل، ہر کیفیت، خواص وصفات کا ہر تغیر اسی عددی تسلسل یا فرق کا نتیجہ تھا۔ لوہا، لوہا تھا تو اس لئے کہ اس میں الیکٹران، پروٹان اور نیوٹران کی ایک معیّن مقدار تھی، اور سونا، سونا اس لئے تھا کہ اس میں یہی اجزاء، ایک اور مقررہ تعداد میں تھے۔ اور پھر زندہ موجودات پر تحقیق کرنے والوں کو پتہ چلا کہ ہر ذی حیات بھی جن اجزاء سے وجود میں آتا ہے، ان کی ابتدائی تعداد ہر نوع کے لئے الگ الگ معیّن ہے۔ یہ جینز ہیں، اور ان میں موجود ڈی این اے ہے جن کی ایک مقدار انسان بناتی ہے تو دوسری حیوان کو وجود دیتی ہے۔ غرض ہر جگہ مقدار اور تعداد کا کھیل نظر آیا۔ کائنات کی بوقلمونیوں میں، اس کی نیرنگیوں

میں ہر طرف مقداروں کی کرشمہ سازی دکھائی دی۔

یہ مادہ کی ہر شکل، ہر حرکت کی عددی قیمت تھی اور اس کی معیّن تعداد تھی کہ جس کی بنیاد پر انسان نے قدرت کے حتمی اور یقینی قانون دریافت کیئے اور ان اعداد و شمار ہی کی بنیاد پر وہ اس قابل ہوا کہ وہ مستقبل کے متعلق پیش گوئی کر سکے۔ اس نے ہوا میں نمی کی مقدار دیکھی، حرارت کی مقدار دیکھی، تو یہ بتانے کے قابل ہو گیا کہ کل بارش ہوگی یا مطلع صاف رہے گا۔ اس نے زمین کی رفتار دیکھی، چاند کی رفتار کی پیمائش کی، اور اس قابل ہو گیا کہ چاند نے جس حصہ پر چاہے اور جس وقت خاص پر چاہے، عین اسی جگہ اور اسی وقت، پہنچ جائے۔ وہ اجرامِ فلکی کی معیّن رفتار کی بنیاد پر صدیوں آگے کا حساب لگا کر بتا سکتا ہے کہ سورج اور زمین کے درمیان کب چاند اس طرح حائل ہوگا کہ سورج گرہن ہو جائے گا، اور کب سورج اور چاند کے درمیان زمین یوں آجائے گی کہ چاند گہنا یا ہوا دکھائی دینے لگے گا۔ اور یہ حساب اس قدر یقینی ہے کہ وہ یہ بھی بتا سکتا ہے کہ گرہن کا عمل کس گھنٹے، کس منٹ، کس سیکنڈ میں شروع ہوگا، اور کب ختم ہوگا، کہاں دیکھا جا سکے گا اور کہاں نہیں دیکھا جا سکے گا۔

غرض کائنات میں انسان نے جس موجود کو سمجھنا چاہا، جس تخلیق الٰہی پر تحقیق کی اسے یہی نظر آیا کہ ہر جگہ مقدار معیّن کی جلوہ فرمائی ہے، ہر جگہ اعداد کار فرما ہیں۔ اور یہی مقدار اور تعداد کا معیّن اور مقرر ہونا اس بات کی شناخت بن گیا کہ اس کائنات کو خلق کرنے والا کوئی حکیم و دانا وجود ہے، جو علیم و خبیر بھی ہے اور صاحب قدرت و اختیار بھی ہے کہ اس نے اپنی مخلوق میں کسی کو مقدار اور تعداد سے مستثنیٰ نہیں کیا، کسی جگہ اس کی معیّن مقدار میں فرق نہیں آیا، اور کبھی اس تعداد و مقدار میں کمی بیشی نہیں ہوئی۔ گویا ہر تخلیق میں، یہ مقدار، یہ اعداد و شمار موجود بھی ہیں، اور آیاتِ الٰہی کی حیثیت سے موجود ہیں اور

معرفت کردگار کا وسیلہ ہیں۔

مادے کی حد تک تو اللہ کا یہ ارشاد ہمارے مشاہدے میں آ گیا کہ اس نے اپنی ہر تخلیق کو ایک مقدار معیّن میں خلق کیا۔ لیکن اس کی ہر تخلیق صرف مادے سے ہی وجود میں نہیں آئی۔ اس نے غیر مادی وجود بھی خلق کیے ہیں۔ اور ان غیر مادی مخلوقات میں ایک مخلوق، اس کا کلام ہے، جسے قرآن کہتے ہیں۔ اب ارشادِ الٰہی عمومی ہے کہ ہم نے کل اشیاء کو ایک مقرر مقدار اور معیّن پیمانے پر خلق کیا ہے۔ تو اس کل کا ایک جزوٗ قرآن بھی ہے۔ اور اس پر بھی مقدار معیّن کا کلیہ صادق آنا چاہیئے۔ اور قرآن حکیم میں بھی کسی نہ کسی اعتبار سے ''مقدار'' یا ''قدر'' کا کوئی تصور ضرور ہونا چاہیئے۔

اب صورتِ حال یہ ہے کہ کلام یا عبارت کے اجزاء، الفاظ ہیں، اور الفاظ کے اجزائے ترکیبی حروف ہیں۔ گویا کلام یا عبارت، حروف کے خلیوں یا سالموں سے مل کر وجود میں آتی ہے۔ چنانچہ کسی بھی کلام میں کسی مقدار کی تلاش کا پہلا میدان اس کلام یا عبارت کے حروف ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ قرآن حکیم کا ہر لفظ بھی حروف سے ہی بنا ہے۔ لیکن لفظوں کی تعمیر میں اینٹ کی حیثیت رکھنے والے حروف سے پہلے، ہماری توجہ کا مرکز ان حروف کو ہونا چاہیئے جو اس کلام میں مفرد طور پر آئے ہیں۔ اور یہ اس لئے کہ پورے قرآن کے حروف کے مقابلے میں ان کی تعداد بہت کم ہے اس لئے ان کا تجزیہ نسبتاً آسان ہے، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ دوسرے حروف، جو کسی لفظ کا جزوٗ ہیں، وہ اپنے معنی ومفہوم کی وجہ سے، جہاں ہیں وہاں ہونے کا قابل فہم جواز رکھتے ہیں، جب کہ مفرد حروف، جب تک ان میں کوئی غیر معمولی حکمت پنہاں نہ ہو، ان کا کسی کلام میں ہونا جواز کے بغیر ہوگا۔ اس ساری بحث سے یہ بات واضح ہو جانی چاہیئے کہ سورۃ القمر کے فرمان پر عمل کرتے ہوئے، مقدار یا تعداد کی تلاش میں جب قرآن حکیم کی طرف رخ کیا جائے

تو سب سے پہلے حروفِ مقطعات میں مقدار کے تسلسل اور ربط کے امکانات کا جائزہ لیا جانا چاہیے۔

ڈاکٹر خلیفہ رشاد کی تحقیق

حروفِ مقطعات میں کسی حسابی ربط کی تلاش کا کام پہلی مرتبہ ایک مصری نژاد کیمیا دان ڈاکٹر خلیفہ رشاد[1] نے کیا۔ ڈاکٹر خلیفہ رشاد ۱۹۷۰ء کی دہائی میں، امریکہ کی ریاست میسوری کے شہر سینٹ لوئیس میں غذائی اشیاء بنانے والی ایک کمپنی میں مشیر کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کے تین سال حروفِ مقطعات پر خصوصی توجہ اور محنت کرتے ہوئے گزارے۔ ان تین سالوں میں پہلے دو سال قرآن مجید کی تمام سورتوں میں آنے والے حروف کی الگ الگ گنتی کرنے میں لگے۔ یہ کام آسان نہیں تھا، لیکن کمپیوٹر کی ایجاد نے مشکل آسان کر دی، اس وقت تک کمپیوٹر بھی نہ آج کی طرح ترقی یافتہ تھے نہ عام لوگوں تک ان کی رسائی تھی۔ لیکن مذکورہ ڈاکٹر نے امریکہ میں مقیم مسلمانوں کی مالی مدد سے اس سہولت سے فائدہ اٹھایا اور پھر اپنی تحقیقات کے نتائج کو مصر کے ایک ممتاز رسالے ''آخر ساعۃ'' میں شائع کرایا۔ آیت اللہ مکارم شیرازی کی سربراہی میں کام کرنے والی جماعت مؤلفین نے، اس مقالے کا خلاصہ کیا اور اسے سورۂ آل عمران کی شرح کے ذیل میں، تفسیر نمونہ کی دوسری جلد میں نقل کیا۔ (صفحات ۲۳۸ تا ۲۴۱) اس خلاصہ میں بیان کردہ نتائج خاصے دلچسپ ہیں، اور ان کو دیکھ کر یہ احساس ہو جاتا ہے کہ حروفِ مقطعات کا عددی تجزیہ محض ایک کوشش رائیگاں نہیں ہے۔ ڈاکٹر خلیفہ

---

[1] خلیفہ رشاد کیلئے اس کے ایک بڑے کارنامے کے باوجود، عزت و احترام کے کسی لفظ کا استعمال نہ کرنے کا سبب جاننے کیلئے سب کتاب کے آخر میں خلیفہ رشاد کے موضوع کے تحت ضمیمہ نمبر ۲ ضرور ملاحظہ کیجئے۔

رشاد نے پہلے تو ہر سورہ میں تمام حروف کا الگ الگ شمار کیا۔ پھر ہر سورۃ کے مجموعی حروف کے مقابلے میں اس میں آئے ہوئے حروف کا علیحدہ علیحدہ فی صد تناسب نکالا۔ اور پھر اس تناسب کا دوسری سورتوں میں، ان ہی حروف کے تناسب سے موازنہ کیا۔ اس طرح کچھ چونکا دینے والے حقائق سامنے آئے مثلاً:

قرآن مجید کی ۱۱۴ سورتوں میں حرف ق، سورہ ق میں نسبتاً سب سے زیادہ استعمال ہوا ہے۔

حرف ص باقی سورتوں کے مقابلے میں، سورہ ص میں بہ اعتبار تناسب سب سے زیادہ استعمال ہوا ہے۔

حرف ن سورۃ الحجر کے بعد سورہ والقلم میں، جو نون کے حرف مقطع سے شروع ہوتی ہے، سب سے زیادہ استعمال ہوا ہے۔ یہاں سورہ حجر ایک استثنیٰ ہے۔ لیکن یہ استثنیٰ بھی باقی نہیں رہتا جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ سورۃ الحجر ان چھ سورتوں میں سے ایک ہے جو حروف مقطعات الم سے شروع ہوتی ہیں۔ اور ان تمام سورتوں کو ہی ایک قسم قرار دیتے ہوئے، جب ان سب کے مجموعی حروف سے حرف ن کی نسبت نکالی گئی تو معلوم ہوا کہ سورہ والقلم میں ن کی تعداد کا تناسب سے زیادہ ہے۔

ال م ص سورہ اعراف کی ابتداء میں آئے ہیں، اب اگر اس سورہ میں آنے والے تمام حروف کے مقابلے میں ان حروف کی تعداد دیکھی جائے تو قرآن حکیم کی باقی سورتوں میں ان چار حروف کا تناسب کم ہے، یہی حال سورہ مریم میں کھیعص کا ہے۔

اور جو حروف مقطعات ایک سے زیادہ سورتوں میں آئے ہیں، جیسے الم، الر، المر، تو ان حروف کے تحت آنے والی تمام سورتوں کے حروف کو جمع کیا گیا تو یہاں بھی وہی صورتِ حال تھی کہ تمام دوسری سورتوں کے مقابلے میں، ہر مجموعے میں ان کے حروف مقطعات کا تناسب زیادہ تھا۔

ان اعداد وشمار سے بظاہر نہ کوئی معنی نکلتے ہیں نہ کوئی نتیجہ۔ لیکن ایک بات تو بہر طور سامنے آتی ہے کہ حروفِ مقطعات والی تمام سورتوں میں، ہر جگہ ان سورتوں کے حروفِ مقطعات کا، دوسری سورتوں کے مقابلے میں، بہ اعتبار تناسب زیادہ ہونا ایک ایسی صورتِ حال ہے جسے اتفاقی یا حادثاتی نہیں کہا جا سکتا۔ اور یہ بات بھی بالکل ناقابل قیاس ہے کہ کوئی انسان ۲۳ سال کے عرصہ میں جتنا کلام کرے اس میں یہ لحاظ رکھے کہ کسی ایک سورہ میں کچھ مخصوص حروف، باقی ماندہ حروف کے مقابلے میں اتنی تعداد میں آئیں کہ باقی ۱۱۳ سورتوں میں اس حرف کا تناسب کم رہے۔ اگر آج کمپیوٹر نہ ہوتا تو اس حساب کو کرنے میں عمریں صرف ہو جاتیں، چہ جائے کہ کوئی اس اہتمام کے ساتھ کلام کر سکتا۔ صرف نسبت تناسب کی یہ صورتِ حال ہی یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ یہ کسی انسان کا کارنامہ نہیں بلکہ ایسی ذات کا کلام ہے جو سریع الحساب ہے، اور جسے اس سے بھی پیچیدہ حسابات کے لئے کسی کی مدد لینے کی ضرورت نہیں۔

اور یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ یہ حقائق آج دریافت ہو رہے ہیں۔ اس سے پہلے اگر اس طرح کا کوئی اشارہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے ملتا کہ حروفِ مقطعات والی سورتوں میں ان حروف کا استعمال نسبتاً زیادہ ہوا ہے تو یہ گمان کیا جا سکتا تھا کہ صاحب تحریر نے، بڑے تکلف اور زحمت سے سہی، لیکن یہ التزام خود کیا

ہے، لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان حقائق کی طرف انسان کی توجہ، نزولِ قرآن کے چودہ سو سال کے بعد ہوئی ہے تو ماننا پڑتا ہے کہ یہ کسی ایسے بے نیاز کی طرف سے ہے جو اپنی نشانیوں سے کسی کو متاثر کرنے کی پرواہ نہیں کرتا۔ اس نے اپنی آیات کو ہر عہد کے انسان کی غور و فکر کے لئے یوں آزاد رکھا ہے کہ صرف دعوتِ فکر دی ہے، فکر کے لئے کوئی معیّن سمت نہیں بتائی۔ آج کا انسان یہاں تک پہنچا ہے، آنے والے کل کا انسان نامعلوم اور کیا کیا دریافت کرے گا۔ حروفِ مقطعات کے متعلق یہ حقائق، اور وہ بہت سے انکشافات جن کا تذکرہ آئندہ کی سطور میں کیا جائے گا، اپنی نوعیت کے اعتبار سے فطرت کے دوسرے رازوں سے مشابہت رکھتے ہیں، کہ فطرت بھی اپنے چہرے کے نقاب خود نہیں اٹھاتی بلکہ کسی جرأت آزما ہاتھ کی منتظر رہتی ہے، اسی طرح قرآن حکیم بالعموم اور حروفِ مقطعات بالخصوص ہر عہد کے انسان کو ایک نئے زاویے اور ایک نئے گوشے سے آگاہی عطا کرتے ہیں، بشرطیکہ کوئی آگاہ ہونا چاہے۔ یہ مشابہت خود اس بات کی عکاس ہے کہ قرآن حکیم بھی اسی بے نیاز کا کلام ہے جس نے فطرت کو وجود عطا کیا ہے۔

اس کے ساتھ ہی ضمنی طور پر یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ قرآن مجید ہر تحریف اور تغیر سے محفوظ ہے، اگر اس میں تحریف ہوئی ہوتی تو آج جو حسابی یکسانیت نظر آتی ہے، یہ موجود نہ ہوتی۔

یہ تحقیقات ابتدائی نوعیت کی ہیں، لیکن ان تحقیقات سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ حروفِ مقطعات کا حسابی جائزہ اپنے اندر قابل توجہ نتائج کے امکانات رکھتا ہے، اور اگر اس زاویہ سے ان حروف پر مزید غور و فکر کی جائے تو اور زیادہ اہمیت کے حامل نتیجے بھی برآمد ہو سکتے ہیں۔

ایک اور انکشاف

قرآن مجید اور ''۱۹'' کا عدد

چنانچہ مزید غور و فکر کیا گیا تو توقع کے عین مطابق، کچھ اور باتیں سامنے آئیں۔ ان باتوں میں سرفہرست قرآن مجید کا ۱۹ کے عدد سے گہرا تعلق ہے۔ تفصیلات میں جانے سے پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ ۱۹ کا عدد کیسے سامنے آیا۔

قرآن مجید کا آغاز بسم اللہ سے ہوتا ہے۔

﴿بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾

اس بسم اللہ میں ذرا حروف کی تعداد دیکھیے۔ بسم میں ب س م تین حروف، اللہ میں ا ل ل ہ چار، الرحمٰن میں ا ل ر ح م ن چھ اور الرحیم میں ا ل ر ح ی م چھ حروف، اس طرح حروف کی مجموعی تعداد ۱۹ ہوئی۔ چلیے، کوئی خاص بات نہیں، ہر جملے اور ہر لفظ کے حروف کا کوئی نہ کوئی مجموعہ ہوتا ہے۔

قرآن حکیم میں کل ایک سو چودہ سورتیں ہیں۔ ان میں سے ۱۱۳ سورتوں کا آغاز بسم اللہ سے ہوتا ہے۔ صرف ایک سورہ توبہ یا سورۂ برأت ہے کہ جو بغیر بسم اللہ کے ہے۔ اس ایک سورہ کو بغیر بسم اللہ کیوں رکھا گیا اس کی مصلحت تو وہی جانتے ہیں جن کو علم قرآن اللہ کی طرف سے عطا کیا گیا ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اگر ایک سورہ میں بسم اللہ نہیں ہے تو ایک سورہ ایسی ہے کہ جس میں دو مرتبہ بسم اللہ ہے۔ یہ سورۃ قرآن حکیم کی ۲۷ ویں سورۃ النمل ہے۔ اس سورہ میں ایک مرتبہ تو ویسے ہی بسم اللہ ہے جیسے باقی ۱۱۲ سورتوں میں ہے، پھر اس کی ۳۰ ویں آیت میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط، ملکہ بلقیس کے نام نقل کیا گیا ہے اس خط کا آغاز بھی بسم اللہ سے ہوتا ہے۔ اس طرح قرآن حکیم کی

سورتوں کی تعداد بھی ۱۱۴ ہے اور اس میں بسم اللہ بھی ۱۱۴ ہی مرتبہ ہے۔ اور یہ ایک سو چودہ کا عدد ۱۹ سے پورا پورا تقسیم ہو جاتا ہے (۱۹x۶ = ۱۱۴) یہ بھی ایک اتفاق ہو سکتا ہے۔

بسم اللہ میں کل چار الفاظ ہیں۔ بسم، اللہ، الرحمٰن اور الرحیم۔ اب پورے قرآن حکیم میں علاوہ بسم اللہ کے، بسم کا لفظ مزید ۱۹ مرتبہ آیا ہے، اللہ کا لفظ قرآن حکیم میں بہت کثرت سے آیا ہے، یعنی دو ہزار چھ سو اٹھانوے (۲۶۹۸) مرتبہ، الرحمٰن ستاون (۵۷) بار آیا ہے اور الرحیم پچانوے (۹۵) بار۔ اب تک ۱۹ کے عدد کی تکرار کو محض اتفاق سمجھ کر نظر انداز کر دینے کے بعد، اب کلام الٰہی کی عظمت کے سامنے سر جھکا دینا پڑا جب ہم نے یہ دیکھا کہ ۱۹ کو ایک سے ضرب دیں تو حاصل ضرب ۱۹ ہوتا ہے، اگر ۱۴۲ سے ضرب دیں تو ۲۶۹۸ ہوتا ہے، اگر تین سے ضرب دیجیے تو جواب ۵۷ ہے اور اگر ۱۹، پانچ سے ضرب کھائے تو حاصل ضرب ۹۵ ہے۔ یعنی قرآن مجید میں، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے تمام الفاظ مختلف تعداد میں آنے کے باوجود، کسی نہ کسی عدد سے ۱۹ کا حاصل ضرب ہی ہیں۔

بسم اللہ میں ۱۹ کے عدد کی اس تکرار سے پہلی بات تو یہ سامنے آئی کہ یہ محض اتفاق نہیں ہے، کیونکہ اگر پوری گنتی کے کسی حصے سے، کوئی سے مسلسل سو اعداد لیے جائیں تو ان میں ایسے اعداد جو ۱۹ سے پورے پورے تقسیم ہو جائیں، صرف پانچ ہوں گے۔ یعنی دوسرے الفاظ میں اس بات کا صرف پانچ فی صدی امکان ہے کہ کہیں ایسا عدد آ جائے جو ۱۹ کا حاصل ضرب ہو۔ اب اگر بسم اللہ کے ہر طریقہ سے شمار کیئے جانے پر جو عدد آئے وہ ۱۹ سے پورا پورا تقسیم ہو جائے تو یہ محض اتفاق نہیں ہو سکتا......... اور جب یہ اتفاق نہیں ہے تو پھر ہمیں ماننا ہوگا کہ ۱۹ کا ہندسہ بسم اللہ میں ایک باطنی ربط کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس دریافت کے بعد ہمیں دیکھنا ہے کہ کیا بسم اللہ میں ربط کا کام دینے والا یہ

عدد حروفِ مقطعات سے بھی کوئی تعلق رکھتا ہے؟

”۱۹“ کا عدد اور حروفِ مقطعات

قرآن حکیم کے حروف اور ۱۹ کے عدد کے درمیان غیر معمولی ربط کی تلاش کا ٥م خلیفہ رشاد نے کیا تھا۔ اسی اثناء میں امریکہ کی ریاست ایروزونا میں ایک اور مصری ڈاکٹر حبیب اللہ نو بخت نے بھی کمپیوٹر کی مدد سے قرآن حکیم کے بارے میں تحقیقات کیں۔ اس کے بعد، اپنی تحقیقات پر مشتمل، انگریزی زبان میں، ایک کتاب لکھی جس میں بہت سے جدول اور گوشوارے درج کیے جن میں ۱۹ کے عدد کی بار بار تکرار کے مزید ثبوت جمع کیے۔

خاص طور پر حروفِ مقطعات کے بارے میں جو بات سامنے آئی وہ یہ تھی کہ کل ۲۹ سورتوں میں اس طرح کے حروف استعمال ہوئے ہیں۔ لیکن ان میں سے کئی مقطعات ایک سے زیادہ مرتبہ آئے ہیں۔ مثلاً **الم** چھ مرتبہ، یا **الر** چار مرتبہ۔ ان مکرر آنے والے حروف کو صرف ایک ایک مرتبہ شمار کیا جائے تو ۱۴ ایسے مفرد یا حروف کے مجموعے ہیں جو بطور حروف مقطعات استعمال ہوئے ہیں۔ ان چودہ ٹکڑوں میں جو حروف استعمال کیے گئے ہیں ان میں سے بھی بعض ایک سے زیادہ مرتبہ آئے ہیں مثلاً الم اور الر میں ال کی تکرار ہوئی ہے۔ چنانچہ ان مکررات کو چھوڑ دیا جائے تو کل ۱۴ حروف ہیں جن کو بطور حروف مقطعات بیان کیا گیا ہے۔ گویا ۱۴ حروف سے بننے والے، ۱۴ ہی حروف مقطعات ۲۹ سورتوں میں آئے ہیں۔ گویا

۱۴+۱۴+۲۹=۵۷

اور ۵۷ کا عدد ۱۹ سے پورا پورا تقسیم ہوتا ہے۔

یہ حساب کسی حد تک پیچیدہ ہے۔ میں ایک بالکل سامنے کے سیدھے سادے حساب کی طرف توجہ دلاؤں۔ یہ عرض کیا جا چکا کہ حروفِ مقطعات چودہ مختلف شکلوں میں آئے ہیں۔ ذرا ان تمام شکلوں کے حروف کا شمار کیجیے الم تین حرف، المص چار حرف، الر تین حرف، المر چار حرف، حم دو حرف، حم عسق پانچ حرف، طس دو حرف، طسم تین حرف، طہ دو حرف، یس دو حرف، کھیعص پانچ حرف، اور ص ایک، ق ایک، ن ایک .... یہ کل ہوئے اڑتیس (۳۸) حروف۔ اور ۱۹ کو دو سے ضرب دیں تو ۳۸ بنتا ہے۔ گویا حروفِ مقطعات میں ۱۹ کی تکرار ہے۔

"۱۹" کی معنویت

ابھی مزید تحقیقی نتائج سامنے آئیں گے۔ لیکن اس سے پہلے ایک سوال پر نظر ڈال لی جائے۔ آخر یہ ۱۹ کا عدد ہی کیوں؟ کوئی اور عدد کیوں نہیں۔ تو پہلی بات تو یہ کہ ایسے سوال کا کوئی جواز نہیں، کسی بھی مجموعہ حروف کی مجموعی تعداد گنتی کا کوئی نہ کوئی ہندسہ ضرور ہوگی، تو اس سے کیا کہ کوئی مجموعہ ۱۸ ہے، ۲۱ ہے یا پھر ۱۹ ہے۔ اگر روشنی کی ایک معیّن رفتار ہے، اگر آکسیجن کے ایک ایٹم میں آٹھ الیکٹران ہوتے ہیں، اگر زمین کی سورج کے گرد گھومنے کی رفتار ۳۰ ہزار میل فی گھنٹہ ہے، اگر پانی کی کسی بھی مقدار میں دو حصہ ہائیڈروجن اور ایک حصہ آکسیجن ہوتی ہے، تو یہ سب اعداد قدرت کے نظام میں باقاعدگی اور تسلسل کا پتہ دیتے ہیں، ان میں کسی قسم کی اور معنویت نظر آجائے تو یہ الگ بات ہے، لیکن لازماً کسی معنویت کا ہونا ضروری نہیں۔ یہی بات حروفِ مقطعات کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ اس ۱۹ کے عدد کو ہم ان حروف کے داخلی ربط کی شہادت قرار دے سکتے ہیں، اور اس سے نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ یہ حروف یونہی بے مقصد کہے گئے

حروف نہیں ہیں بلکہ ان میں گہرا نظم پایا جاتا ہے۔ کیا تنہا یہی ایک حقیقت، ہمیں ان حروف کے اعجاز سے متعارف کرانے کے لئے کافی نہیں ہے؟

لیکن اگر مزید غور کیا جائے تو ۱۹ کے عدد میں ایک خصوصیت یہ نظر آتی ہے کہ یہ دو ہندسوں کا مجموعہ ہے، ایک تو ایک ہے اور دوسرا نو ہے۔ اب تمام ہندسوں میں ایک حرف آغاز ہے، سرتا پا وحدت ہی وحدت، دوسرا نو ہے جو ہندسوں میں آخری ہندسہ ہے، یہ اپنی ذات میں کثرت ہی کثرت ہے۔ اب ہماری کائنات کی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ ایک تو وہ ذات ہے جو وحدت ہی وحدت ہے، یعنی اللہ کی ذات، اور اس کے بعد اس کی صفات کے لاتعداد مظاہرے ہیں، کثرت ہی کثرت۔ اگر اس وحدت اور کثرت کو اعداد کے ذریعہ ظاہر کیا جائے تو ۱۹ کے عدد کے سوا اور کوئی عدد ان دونوں حقیقتوں کی نمائندگی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۹ کو، حروفِ مقطعات کا جوہر قرار دے کر اللہ نے اس عدد کے ذریعہ خالق و مخلوق کو علامتی طور پر ان حروف میں ظاہر کر دیا ہے۔

مزید آگے بڑھیے۔ ۱۹ کا ہندسہ دو اعداد یعنی نو اور ایک کا مرکب ہے۔ علم الاعداد میں ایک قاعدہ ہے جسے تکسیر کا قاعدہ کہتے ہیں۔ اس قاعدہ کی رو سے نتائج اخذ کرنے کے لئے، مرکب اعداد کے اجزاء کو جمع کر کے مفرد بنا لیا جاتا ہے چنانچہ اسی طریقے کو استعمال کرتے ہوئے، جب ایک اور نو کو جمع کیا تو پہلی منزل پر دس کا عدد حاصل ہوا۔ اس دس میں ایک تو وہی ایک ہے اور دوسرا صفر ہے۔ صفر اپنے طور پر کوئی عدد نہیں۔ یہ اگر کسی عدد کے ساتھ ہے تو بڑی قیمت رکھتا ہے، لیکن محض صفر ہو تو اس میں کوئی قیمت نہیں۔ ہم نے ابھی دہائی کے ہندسے کو وحدت الٰہی کا مظہر قرار دیا تھا اور اکائی کو کائنات کا۔ اب اسی اصول کو مدنظر رکھیے تو دس میں ایک اللہ کا مظہر ہے اور صفر ماسوا کا۔

اور بلیغ اشارہ یہ ہے کہ کائنات میں جو اپنے خالق سے وابستہ ہے، تقرب الٰہی رکھتا ہے، اس کی بڑی قیمت ہے اور جو اس سے الگ ہے، دور ہے وہ بے وقعت ہے نہ ہونے کے برابر ہے۔

اور ابھی ۱۹ کا عدد مفر نہیں ہوا۔ دس کے ایک اور صفر کو جمع کیجیے تو جواب ایک آیا، جو اس بات کی علامت ہے کہ حقیقت باقیہ صرف ذاتِ واحد ہے، باقی اور کچھ اس طرح ہے کہ ع

ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

گویا اشارہ ہے کہ یہ کائنات جسے تم موجود سمجھتے ہو، فقط ایک ذاتِ واحد کی کارفرمائی ہے۔ وہ واحد ہی موجود تھا، اس نے کائنات بنائی، یہ کائنات پھر وجود سے عدم میں چلی جائے گی لیکن وہ ایک پھر بھی موجود رہے گا۔

اور اب تمام مضامین قرآن پر نظر ڈالیے تو قرآن، یا تو وجودِ خدا کے ہونے کا اعلان ہے، اس کی توحید کا تذکرہ ہے، اس کی مخلوق کا ذکر ہے، مخلوق و خالق کے تعلق کا بیان ہے، یا پھر ہر شے کے فنا ہو جانے اور صرف اس کے باقی رہ جانے کی خبر ہے۔ اور جب یہ سارے مضامین ۱۹ کے عدد سے بخوبی ظاہر ہوتے ہوں تو ہم الٰہی کلام کی عظمت کے سامنے کیوں نہ سر جھکائیں کہ اس میں اگر مقدار کی صورت میں کسی عدد کو پیش نظر رکھا گیا تو وہ ایسا عدد تھا جو پورے ارشاداتِ الٰہی کا ترجمان تھا۔ کیا ۱۹ کی جگہ کوئی اور عدد یہ مطالب بیان کر سکتا تھا؟ اور کوئی اور عدد مضامین قرآن کی یوں نمائندگی کر سکتا تھا؟

"۱۹" کے عدد پر تحقیق مزید

حروفِ مقطعات میں ۱۹ کا عدد کیوں نمایاں ہے، یہ بحث ضمنی تھی۔ ذرا حروفِ

مقطعات اور ۱۹ کے عدد کے باہمی تعلق پر مزید نظر ڈالیئے۔

قرآن حکیم کی جن ۲۹ سورتوں کی ابتدا میں یہ حروف آئے ہیں، ان سورتوں کے متن میں بھی، کسی دوسرے لفظ کے جزو کی حیثیت سے، یہ حروف کئی بار استعمال ہوئے ہیں۔ جیسے:

﴿الٓمٓ ٥ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ......﴾

سورہ بقرہ کے اس جزو میں الم کا الف پانچ بار، لام چھ مرتبہ، اور میم دو دفعہ آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک نامکمل جملے میں اگر یہ حروف ۱۳ کی تعداد میں ہیں تو ڈھائی سے زیادہ سپاروں پر پھیلی ہوئی، ۲۸۶ آیات پر مشتمل، سورہ بقرہ میں یہ تین حروف ہزاروں کی تعداد میں آئے ہوں گے۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ ۲۹ سورتوں میں آئے ہوئے تمام حروف کو شمار کیجیے تو یہ انتہائی دقت طلب اور مشکل فرمائش ہوگی۔ لیکن کچھ تو بعض ارباب ہمت نے یہ کام کر دیئے ہیں، اور کچھ کمپیوٹر نے مشکل حسابات کی ذمہ داری اٹھالی ہے، چنانچہ ایسے کئی سافٹ ویئر بہ آسانی فراہم ہو جاتے ہیں، جن میں قرآن مجید سے متعلق تمام ممکنہ اعداد و شمار جمع کر دیئے گئے ہیں۔ صاحبانِ ذوق ان سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ گفتگو کو جاری رکھنے کے لئے یہاں صرف حاصل شدہ نتائج کا ذکر کافی ہوگا۔ مزید عددی تفصیل آخر میں دیئے گئے ضمیمہ نمبر 1 میں ملاحظہ فرمایئے۔

الٓمٓ

قرآن حکیم کی چھ سورتیں، بقرہ، آل عمران، عنکبوت، روم، لقمان اور سجدہ، الم کے حروف سے شروع ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ سورہ اعراف میں المص ہے اور سورہ رعد

میں المر ہے۔اس طرح آٹھ سورتیں ہیں جن میں الم کے حروف ابتداء میں آئے ہیں۔ ان میں سے پہلی چھ سورتوں میں ان تینوں حروف کا مجموعہ 20052، سورۂ اعراف میں 5260، اور سورۂ رعد میں 1364 ہے گویا آٹھوں سورتوں میں الف، لام اور میم کے حروف کی مجموعی تعداد چھبیس ہزار چھ سو چھہتر (26676) ہے۔اب اسے ۱۹ سے تقسیم کیجیئے تو چودہ سو چار مرتبہ پورا پورا تقسیم ہو جائے گا۔

الرٰ

پانچ ایسی سورتیں ہیں جن کا آغاز الر سے ہوتا ہے۔ یہ سورتیں یونس، ھود، یوسف، ابراہیم اور الحجر ہیں۔ ان میں الف، لام اور راء کا مجموعہ نو ہزار پانچ سو بہتر (9572) ہے۔اسے ۱۹ سے تقسیم کیجیے، حاصل تقسیم پانچ سو گیارہ آئے گا اور باقی کچھ نہیں بچے گا۔

طسٓمٓ

طسم والی دو سورتوں، الشعراء اور القصص میں ان حروف کی تعداد =1195

طس سے شروع ہونے والی ایک سورۃ النمل میں ط اور س کی تعداد =93

طہ سے شروع ہونے والی ایک سورۃ، سورہ طہ میں حرف ط کی تعداد =28

یٰس سے شروع ہونے والی ایک سورۃ، سورہ یٰس میں حرف س کی تعداد =48

حم عسق سے شروع ہونے والی ایک سورہ شعریٰ میں حرف س کی تعداد =53

میزان ط س م =1444

اور چودہ سو چوالیس، ۱۹ سے (۷۶ مرتبہ) پورا پورا تقسیم ہو جاتا ہے۔

طٰسٓ

یوں تو طٰسٓ کا شمار اوپر کی سطور میں طٰسٓمٓ سے شروع ہونے والی سورتوں میں کیا جا چکا ہے، لیکن اگر طٰسٓمٓ سے صرف طٰسٓ کو الگ کر لیں، اور سورہ نمل میں آنے والے ان دو حروف مقطعات کا الگ جائزہ لیں تو یہ صورت سامنے آتی ہے کہ

طس والی سورہ نمل میں ان دو حروف کی تعداد	=	20
طسم والی دو سورتوں میں ان دو حروف کا شمار	=	245
طه والی سورہ طہٰ میں ط کے حرف کا استعمال	=	28
یس والی سورہ یٰس میں س کے حرف کا استعمال	=	48
حم عسق والی سورہ شوریٰ میں حرف س کی تعداد	=	53

اس طرح طا اور سین کے حرف، حروف مقطعات والی سورتوں میں مجموعی طور پر 494 بار استعمال ہوئے ہیں اور حسب معمول یہ عدد بھی انیس کا چھبیس سے حاصل ضرب ہے۔

حٰمٓ

حم کے حروف سے چھ سورتیں شروع ہوتی ہیں۔ المومن، حم السجدہ، الزخرف، الدخان، الجاثیہ اور الاحقاف۔ ان کے علاوہ حم کا جزو سورہ شوریٰ میں بھی تین اور حروف کے ساتھ آیا ہے۔ اب چاہیں تو ان ساتوں سورتوں میں لفظ حا اور میم کو جمع کر لیں یا سورہ شوریٰ کے حم کو الگ شمار کریں، ہر دو صورت میں ایک ہی نتیجہ حاصل ہوتا ہے۔ پہلی چھ سورتوں میں حا اور میم کی تعداد ایک ہزار آٹھ سو پانچ (1805) ہے اور اگر ساتویں کو بھی شامل کیجیے تو یہ تعداد دو ہزار ایک سو چھیاسٹھ (2166) ہو جائے گی۔ پہلے عدد کو ۱۹، تین سو بیالیس بار تقسیم کرتا ہے اور دوسرے عدد کو تین سو اکسٹھ بار۔ دونوں مرتبہ باقی کچھ نہیں بچتا۔

حمٓ o عسٓق

سورۃ الشوریٰ پانچ حروف حم عسق سے شروع ہوتی ہے۔ پوری سورہ میں حم کے حروف 361 بار آئے ہیں، اور عسق کے حروف 209 مرتبہ استعمال ہوئے ہیں۔ اب چاہیں تو ان دونوں مجموعوں کو الگ الگ ۱۹ سے تقسیم کریں۔ چاہیں ان کے میزان یعنی 570 کو تقسیم کرلیں، ہر عدد ۱۹ سے پورا پورا تقسیم ہوگا۔

کٓھٰیٰعٓصٓ

سورۂ مریم کا آغاز پانچ حروف مطقعات، ك، ہ، ی، ع اور ص سے ہوتا ہے۔ اس سورہ میں یہ پانچ حروف مجموعی طور پر 798 مقامات پر آئے ہیں۔ اور 798 انیس سے بیالیس بار قابل تقسیم ہے۔

طٰہٰ

سورہ طہٰ وہ واحد سورۃ ہے جو طا اور ہا کے حروف سے شروع ہوئی ہے۔ اس سورہ میں ان دونوں حروف کی مجموعی تعداد 342 ہے، اور یہ عدد بھی ۱۹ سے اٹھارہ بار تقسیم ہوجاتا ہے۔

یٰسٓ

یہی صورت سورۂ یٰس کی ہے۔ اس سورہ کے دو حروف مقطعات، سورہ میں 285 بار آئے ہیں، اور یہ عدد بھی ۱۹ سے (پندرہ مرتبہ) قابل تقسیم ہے۔

قٓ

حرف ق، حروف مقطعات میں دو مقامات پر آیا ہے۔ ایک سورہ ق میں مفرد حالت میں، اور دوسرے سورہ شوریٰ میں حم عسق کے جزو کے طور پر ان دونوں سورتوں میں یہ حرف ستاون (57) مرتبہ استعمال ہوا ہے، اور ستاون کا عدد ۱۹ کو تین سے ضرب دینے سے حاصل ہوتا ہے۔

نٓ

تمام حروف مقطعات میں ن کا حرف صرف سورہ والقلم میں آیا ہے، اور اس سورہ میں، اس کی مجموعی تعداد 133 ہے جو ۱۹ سے سات مرتبہ قابل تقسیم ہے۔

صٓ

ص کا حرف، حروف مقطعات میں تین مقامات پر آیا ہے، سورہ ص میں مفرد طور پر اور سورہ مریم اور سورہ اعراف میں دوسرے حروف کے ساتھ اب اس حرف کی عددی تفصیل یہ ہے:

سورہ ص میں ص = 28

سورہ مریم میں = 26

سورہ اعراف میں = 98

اس طرح مجموعی طور پر، ان تین سورتوں میں حرف ص 152 مرتبہ آیا ہے، اور یہ بھی ۱۹ کو آٹھ سے ضرب دینے سے حاصل ہوتا ہے۔ ان بارہ حروف مقطعات کے ساتھ باقی ماندہ دو مجموعے المص اور المر کا شمار کیا جا چکا ہے۔ ان دونوں میں مشترک الم کو ان سورتوں کے

ساتھ شمار کیا جا چکا ہے جن کا آغاز الم سے ہوتا ہے۔ اور المص کے صاد کو ص کے ذیل میں، اور المر کے را کو الر کے تحت شمار کیا جا چکا ہے اس لئے ان حروف کی تفصیل دینا محض تکرار ہوگی۔

اب تک کے دریافت شدہ حقائق انسانی عقل کو حیران و ششدر کرنے کے لئے کافی ہیں۔ تمام حروف مقطعات کا بغیر کسی استثنی کے، یوں ۱۹ کے ساتھ منسلک ہونا ایسی صورت حال ہے جو کسی انسان کی قدرت اور اختیار سے باہر ہے۔ اگر صرف اتنا اہتمام ہوتا کہ ہر حرف مقطع الگ الگ ۱۹ سے قابل تقسیم ہوتا تو یہی کیا کم حیران کن بات ہوتی لیکن یہاں صورت حال یہ ہے کہ پانچ پانچ، چار چار حروف کے مجموعے بھی اسی حقیقت کا اعادہ کرتے ہیں جو مفرد حروف سے عیاں ہے۔ اور اس تواتر سے یہ سب کچھ سامنے آتا ہے کہ کسی موقعہ پر حساب غلط نہیں ہوتا۔ ذرا جو حقائق سامنے آئے ہیں ان پر ایک نظر ڈالیئے۔

جہاں ان حروف یا حرف کو کسی ایک سورہ میں استعمال کیا گیا ہے وہاں صرف اس سورہ میں ۱۹ کا حساب پورا ہو جاتا ہے۔ لیکن جہاں یہ حروف ایک سے زیادہ سورتوں میں آئے ہیں وہاں تمام سورتوں کے حروف کو ملایا جائے تب نتیجہ نکلتا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جن سورتوں میں ایک جیسے حروف آئے ہیں وہ سب ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ اور اگر اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے تو ان سورتوں کی تفسیر کرتے ہوئے ہمیں ایک سورہ کی تشریح دوسری ویسے ہی حروف سے شروع ہونے والی سورہ کو سامنے رکھ کر کرنی چاہیئے۔

پھر یہ بھی پہلو سامنے رہے کہ اگر ایک سورۃ کے حروف مقطعات کا ایک جزو اپنے جیسے دوسرے حروف والی سورتوں سے مل کر واضح ہوتا ہے، تو اس سورہ کے باقی ماندہ

جزو کو ان سورتوں سے ملانا پڑتا ہے جن میں دوسرا جزو پایا جاتا ہے۔ اوپر دی گئی تفصیل میں دیکھیے سورہ اعراف کا المص پہلے تو ان سات سورتوں سے منسلک ہے جن میں الم آیا ہے، پھر ان حروف میں سے ص کو سمجھنے کے لئے سورہ مریم اور سورہ ص سے رابطہ قائم کرنا پڑتا ہے، پھر جب الم رکھنے والی سورتوں میں ایک سورہ الرعد میں الم کے ساتھ حرف را بچ گیا تھا تو اس کے لئے ان پانچ سورتوں کی طرف رجوع کرنا پڑا تھا جن میں حرف را موجود تھا۔ اس طرح ایک سورہ اعراف ۱۳ دوسری سورتوں کے ساتھ منسلک ہے۔ یہ سورتوں کی باہمی بندش کوئی خاص مفہوم دے یا نہ دے کم از کم یہ تو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ بیسیوں صفحات پر پھیلی ہوئی ۱۳ سورتوں کے ہزاروں الفاظ میں تین چار حروف کی تعداد کو اس اہتمام سے استعمال کرنا انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ اور جو بات انسان کے بس میں نہ ہو اور ہو جائے، وہ معجزہ ہوتی ہے۔

اور اس کے ساتھ ہی ضمنی طور پر یہ حقیقت بھی سامنے رہے کہ اگر قرآن حکیم کے الفاظ میں ایک لفظ بھی کم کر دیا جائے، یا اسے تبدیل کر دیا جائے، یا ایک لفظ کا اضافہ کر دیا جائے تو نتائج بدل جائیں گے، اور جو عددی توازن اور باقاعدگی اب نظر آ رہی ہے یہ ختم ہو جائے گی۔ لیکن جب توازن اور باقاعدگی موجود ہے تو پھر ماننا پڑے گا کہ قرآن حکیم میں نہ کوئی لفظ بڑھایا گیا ہے، نہ کم ہوا ہے، نہ تبدیل ہوا ہے۔ یعنی حروف مقطعات کی عددی کیفیت ہی قرآن کو اللہ کی کتاب بھی ثابت کرتی ہے اور اسے ہر قسم کی تحریف سے پاک بھی قرار دیتی ہے۔

ربطِ اعداد کا خصوصی التزام

بات بظاہر مکمل ہو گئی۔ لیکن اس عددی تواتر کو برقرار رکھنے کے لئے ایک اور

اہتمام کا حال سن لیجیے۔ سورہ ق کی بارہویں، تیرہویں اور چودہویں آیت میں عاد، ثمود اور لوط کی اقوام کا تذکرہ آیا ہے۔ ان میں سے قوم لوط کا ذکر قرآن مجید میں کل بارہ مقامات پر کیا گیا ہے۔ ہر جگہ اس قوم کو ''قوم لوط'' کے نام سے متعارف کرایا گیا ہے۔ لیکن سورہ ق وہ واحد جگہ ہے جہاں قرآن حکیم کا انداز بیان بدل گیا ہے۔ یہاں قوم لوط کی بجائے ''اخوان لوط'' کہا گیا ہے۔ یہ نام قوم سے اخوان میں کیوں بدلا؟ اس کی اور مصلحتیں تو اللہ اور اس کا رسولؐ جانے، لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اگر یہاں لفظ قوم ہوتا تو اس صورت میں اس سورہ میں حرف قاف کی تعداد اٹھاون ہو جاتی جو ۱۹ سے پوری پوری تقسیم نہ ہوتی، گویا اخوان کا لفظ آنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قرآن کو نازل کرنے والی حکیم و بینا ذات پوری طرح آگاہ ہے کہ ابھی دوران کلام حرف قاف اور کتنی بار آئے گا، اور قاف کی کتنی تعداد اس کے مقرر کردہ حساب کو درست رکھنے کے لئے کافی ہوگی۔

سورہ ص کا حرف مقطع ص ہے۔ صاد کا حرف سورہ مریم میں کھیعص کا بھی جزو ہے اور سورہ اعراف میں المص کے مجموعے میں بھی آیا ہے۔ سورۃ الاعراف کی ۶۹ ویں آیت میں ایک لفظ ''بصطہ'' آیا ہے۔ با، صاد، طا اور ہا۔

﴿وَ زَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْطَةً﴾

اس ہجہ کے ساتھ پوری عربی لغت میں کوئی لفظ نہیں ہے۔ اس کی جگہ جو لفظ عربی میں ہے اس کی ہجے میں با، سین، طا، ہا، بسطہ ہے۔ جس کے معنی ہیں کشادگی، فراخی۔ اب دلچسپ بات یہ ہے کہ قرآن مجید کے تمام نسخوں میں یہ حرف صاد سے ہی لکھا جاتا ہے لیکن صاد کے اوپر سین بنا دیا جاتا ہے کہ قاری یہاں سین ہی پڑھے، صاد نہ پڑھے۔ اور پھر قرآن حکیم کی لغت پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں، ان تمام میں بھی بصطہ کی بجائے بسطہ لکھ کر اس کے معنی درج کیے گئے ہیں۔ حتیٰ کہ محمد فواد الباقی کی معرکۃ الآراء اور ذمہ دارانہ فہرست

الفاظ قرآن، المعجم المفہرس میں بھی اس لفظ کو سین سے لکھا گیا ہے۔ اور سب سے بڑی بات کہ خود قرآن حکیم نے اس لفظ کو، ان ہی معنوں میں، ایک اور مقام پر استعمال کیا ہے تو وہاں یہ لفظ سین ہی سے لکھا گیا ہے:

﴿قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَ زَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَ الْجِسْمِ﴾ (سورۂ بقرہ۲۔ ۲۴۷)

اس کے علاوہ باء سین طا کے مادے سے بننے والے اس لفظ کی متعدد دوسری شکلیں قرآن حکیم میں کم از کم ۲۳ دوسرے مقامات پر آئی ہیں، ہر جگہ اس لفظ کے تمام مشتقات سین سے ہی لکھے جاتے ہیں۔ پھر سورہ اعراف میں صاد کیوں ہے؟ اس سوال کا ایک جواب تو یہ دیا گیا کہ قرآن کی کتابت کرنے والے چونکہ غیر معصوم تھے اس لئے کسی کاتب نے محض غلطی سے یہاں سین کی جگہ صاد لکھ دیا، اور بعد میں، امت مسلمہ کی کتاب اللہ کے بارے میں انتہائی احتیاط نے، قرآن مجید کی تحریر کو مستند اور محفوظ رکھتے ہوئے اس غلطی سے آگاہ کرنے کے لئے صاد کے اوپر سین تو لکھ دیا، لیکن اصل تحریر میں کوئی مداخلت نہیں کی۔ بلکہ بعض علماء نے تو کتابت کی اس ''غلطی'' کو قرآن مجید کے ہر تحریف سے محفوظ ہونے کی ایک دلیل بھی قرار دیا ہے۔ دوسری طرف ایک اور توجیہہ ڈاکٹر میر محمد علی نے اپنے ایک مقالے میں کی ہے، انہوں نے بغیر کسی حوالے کے، ایک روایت بیان کی کہ ''جب اس آیت کا نزول ہوا تو جبرئیل علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا کہ اپنے کاتب وحی کو حکم دیں کہ وہ اس لفظ کو ص سے لکھیں، نہ کہ س سے۔''

ان دونوں توجیہات میں بوجوہ دوسری بات کو ترجیح حاصل ہے، اولاً اس لئے کہ پہلی توجیہہ کلیتاً قیاسی ہے، جب کہ دوسری کی بنیاد ایک خبر پر ہے ثانیاً قرآن کی کتابت کسی ایک کاتب یا ایک نسخے پر موقوف نہیں تھی، بہت سے افراد نے قرآن حکیم کی

کتابت کی، ظاہر ہے کہ غیر معصوم کاتبوں نے بارہا غلطیاں کیں، لیکن ان غلطیوں کی مسلسل اصلاح ہوتی رہی، پھر ہمارے پاس آج بھی ایسے قرآن حکیم کے نسخے موجود ہیں جن کی نسبت کتابت معصومینؑ کی طرف ہے، کیا ممکن ہے کہ کسی عام کاتب کی غلطی اتنی محترم ہو جائے کہ وارثانِ قرآن بھی اس کو برقرار رکھنے پر مجبور ہو جائیں؟ چنانچہ دوسری توجیہہ، روایت کے معیار پر پوری نہ اترنے کی وجہ سے، رد بھی کر دی جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ اگر سورہ اعراف میں لفظ بسطہ کو ص سے لکھا گیا ہے تو یہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی منشاء کے مطابق ہے۔ اور جب ایسا منشائے ایزدی سے ہوا ہے تو یقیناً اس میں مصلحت ہوگی۔ اب باقی مصلحتیں تو صاحبانِ علم ونظر تلاش کریں، ہمیں تو سامنے کی بات یہ دکھائی دے رہی ہے کہ اگر یہ لفظ اس مقام پر سین سے ہوتا تو سورہائے اعراف، مریم اور ص میں، حرف ص کی تعداد ۱۵۱ ہوتی، جو ۱۹ سے تقسیم نہ ہو پاتی۔ اس ایک ص نے مجموعی تعداد ۱۵۲ کر دی جو ۱۹ اور ۸ کا حاصل ضرب ہے۔

اللہ رے قرآن کا ثبات و استحکام! کہ سورتیں، پھر سورتوں کی آیات، پھر آیات کے جملے، پھر جملوں میں آنے والے الفاظ کو ایک طرف رکھیے، محض الفاظ میں آنے والے حروف کو دیکھیے تو ہر حرف اپنی جگہ اس مضبوطی سے جڑا ہوا ہے کہ اسے اپنے مقام سے ہلا نا ممکن نہیں ہے۔ کیا یہ کسی انسان کا کلام ہوسکتا ہے؟

قرآن صامت اور قرآن ناطق کا ربط

اب تک کی گفتگو سے یہ بات پوری طرح سامنے آ گئی کہ بسم اللہ ہو یا حروفِ مقطعات ہوں، یا حروفِ مقطعات والی سورتوں میں ان حروف کا استعمال ہو، ہر جگہ انیس کا ایک منفرد عدد موجود ہے، قرآن مجید میں ۱۹ کی یہ اہمیت کیوں ہے، یہ غور کرنا ہمارا کام

ہے۔ لیکن ایک بات تو طے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عدد کو پورے قرآن حکیم کی اساسی مقدار قرار دیا ہے۔ یہی قرآن کا عددی ربط ہے، یہی کلامِ الٰہی کی دلیل ہے اور یہی قرآن کی شناخت ہے۔

اور اب اپنے ایمان کو جلا دیجیئے، اسلام کی حقانیت پر اپنے یقین کو مزید مستحکم کیجیئے اور اپنے جذبۂ ایمان کو تازہ کیجیئے .... ہدایت کے دو ذریعے ہیں، ایک قرآن صامت ہے، دوسرا قرآن ناطق ہے۔ دونوں اللہ کی طرف سے ہیں، دونوں معجزہ ہیں، دونوں کی مثال اور جواب لانا انسان کے لئے ممکن نہیں ہے۔ قرآن صامت کا کلیدی، بنیادی اور جوہری عدد ۱۹ قرار پایا، اب ذرا میرے ساتھ مل کر حساب کیجیئے۔ محمدؐ میں چار حرف ہیں، علیؑ میں تین، فاطمہؑ میں پانچ، یہ کل بارہ ہوئے۔ ان میں حسنؑ کے تین حرف جمع کیجیئے، یہ پندرہ ہوئے۔ اب ان میں حسینؑ کے چار حرف شامل کیجیئے، مجموعہ ہوا انیس۔ گویا جو عدد قرآن صامت کی اصل ہے وہی قرآن ناطق کی اصل ہے، اور یہ میرا قیاس سہی، لیکن بے دلیل نہیں ہے کہ قرآن میں ۱۹ کا عدد اس تسلسل سے، اس تواتر سے رکھا ہی اس لئے گیا تھا کہ قرآن اور اہل بیت علیہم السلام کا ربط باہمی ظاہر ہو سکے اور ہر صاحب نظر دیکھ لے کہ جس ذات واحد نے قرآن نازل کیا ہے، اسی نے نسل انسانی کی ہدایت کے لئے اہل بیت علیہم السلام کو معین کیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اللہ کے رسولؐ کا یہ ارشاد بھی واضح ہو جائے کہ قرآن اور اہل بیت علیہم السلام قیامت تک ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔

حروفِ اعجاز......۵

حروفِ مقطعات اور صراطِ مستقیم

حروفِ مقطعات میں عددی حسن اور توازن کی نشان دہی کی جا چکی۔ تمام حروف ۱۹ کے عدد سے جس طرح مربوط ہیں، وہ ایک حیران کن معجزہ ہے لیکن اس معجزے سے آگاہی کے لئے ہمیں طویل حسابی عمل سے گزرنا پڑا۔ جو، ممکن ہے، کچھ ذہنوں پر بار بھی ہوا ہو۔ چنانچہ اب ایک اور حوالے سے ان حروف کا مطالعہ کرتے ہیں، لیکن پہلے ضمناً ایک اور نسبتاً آسان عددی پہلو پر نظر ڈال لیں۔

﴿الٓمٓ، الٓر، الٓمٓر، الٓمٓصٓ، طٰسٓمٓ، کٓھٰیٰعٓصٓ، حٰمٓعٓسٓقٓ، حٰمٓ، طٰسٓ، یٰسٓ، طٰہٰ، نٓ، قٓ، صٓ﴾

اب ان مجموعوں میں کئی حروف بھی ایک سے زیادہ مرتبہ استعمال ہوئے ہیں۔ ان میں سے بھی ایک سے زیادہ مرتبہ آنے والے حروف کو ایک مرتبہ شمار کیجیئے تو ان کی تعداد بھی ۱۴ ہے۔

ا، ل، م، ر، ص، ط، س، ک، ھ، ح، ی، ع، ن، ق۔

حروفِ مقطعات کا ۱۴ ہونا، اور پھر ان میں حروف کی تعداد کا بھی ۱۴ ہونا یوں تو محض ایک اتفاق نظر آتا ہے، لیکن جب یہ دیکھا جائے کہ قرآن ان حروف کو آیاتِ قرآن قرار دیتا ہے، یعنی کتابِ خدا کی معرفت کا ایک ذریعہ، اور دوسری طرف ہم یہ دیکھیں کہ نسلِ انسانی کی ہدایت کے لئے، اللہ کی طرف سے، جو آیاتِ الٰہی بھیجی گئیں ان کی تعداد بھی ۱۴ ہے تو

یہ عددی مماثلت محض اتفاق نہیں لگتی۔ قرآن اور ہادیانِ برحق ایک دوسرے کی تفسیر بھی ہیں اور تصدیق بھی۔ اس سلسلے میں ایک اور تائیدی گوشہ پنجتنؑ کے اسمائے گرامی میں نظر آتا ہے۔ یہ تو پہلے ہی عرض کیا جا چکا کہ اسمائے پنجتنؑ میں حروف کی تعداد ۱۹ ہے ان حروف میں مکررات کو ایک مرتبہ شمار کرنے سے یہ حروف سامنے آتے ہیں:

م، ح، د، ع، ل، ی، ف، ط، ہ، ا، س، ن۔

ان حروف کی تعداد ۱۲ ہے، جو ائمہ اثنا عشر کی تعداد کے برابر ہے۔ اب اگر یہ سوال ہو کہ حروفِ مقطعات میں ۱۴ حروف کیوں ہیں اور اسمائے پنجتنؑ میں بارہ کیوں؟ تو اس سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن کا فریضہ تھا کہ وہ اپنے ساتھ وابستہ پورے سلسلۂ ہدایت کا تعارف کرائے، جب کہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے ساتھ موجود باقی افراد اہل بیتؑ کا فرض منصبی تھا کہ وہ اپنے بعد آنے والے نظامِ ہدایت سے زمانے کو روشناس کرادیں چنانچہ قرآن نے چہاردہ معصومینؑ کی طرف اشارہ کیا، جب کہ اسمائے پنجتنؑ سے صرف سلسلۂ امامت کے افراد کی تعداد معلوم ہوئی۔

اس قیاس کو حروفِ مقطعات میں موجود ایک اور حقیقت سے تقویت ملتی ہے کہ اس کے ۱۴ حروف میں صرف دو حروف، نون اور قاف، ایسے ہیں جو نقطہ دار ہیں، باقی بارہ حروف بغیر نقطے کے ہیں۔ اس بات سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اگر یہ عدد کچھ شخصیات کی طرف اشارہ ہے تو ان میں سے دو افراد باقی بارہ سے کچھ مختلف ہیں۔ اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ چہاردہ معصومینؑ میں سے دو، خدا کا رسولؐ اور بضعۃ رسولؐ ہیں، اور باقی بارہ زمانے کے امامؑ ہیں، تو ہمیں حروف کی یہ تعداد محض اتفاق نہیں لگتی۔

ضروری وضاحت

یہاں ایک بات کہہ دینا بہت ضروری ہے اور وہ یہ کہ یہ جو کچھ کہا گیا، یا کہا جا

رہا ہے، یہ سب ائمہ معصومینؑ کی صداقت کی دلیل کے طور پر بیان نہیں کیا جا رہا۔ ان ذواتِ مقدسہ اور ان کے منصب کی حقانیت اور صداقت اس سے کہیں بلند ہے کہ اس کے لئے محض اعداد کی مماثلت کو بطور دلیل پیش کیا جائے۔ یہ سب کچھ منطقی استدلال بھی نہیں، یہ صرف اور صرف کچھ موجود حقائق میں معنویت اور ربط کی تلاش ہے۔ آپ چاہیں تو زیادہ سے زیادہ، اس ساری گفتگو کو، انتہائی مضبوط بنیادوں پر قائم، رسالت و امامت کی سچائی کی طرف ایک تائیدی اشارہ قرار دے سکتے ہیں اور بس۔

حروف کی ممکنہ ترتیب

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، یہ ایک ضمنی گفتگو تھی۔ اصل بحث یہ ہے کہ حروفِ مقطعات میں استعمال کیئے گئے ۱۴ حروف سے کیا ہم کوئی بامعنی جملہ حاصل کر سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس طرح حاصل ہونے والا جملہ کسی بھی اعتبار سے کسی کے لئے حجت نہیں ہوگا۔ لیکن اگر حاصل شدہ جملہ قرآنی فکر سے مطابقت رکھتا ہو تو کم از کم ایک امکان کی دریافت ضرور ہوگا۔ شرط یہ ہے کہ اس طرح حاصل ہونے والا جملہ زبان و بیان کے تقاضوں کو بھی پورا کرے، بامعنی بھی ہو، فکرِ قرآن اور کتابِ الٰہی کے اسلوب بیان سے ہم آہنگ بھی ہو، اور ان تمام شرائط کے ساتھ اگر اپنے وجود کا کوئی منطقی جواز بھی رکھتا ہو تو یقیناً ایسی دریافت قابلِ قدر ہونی چاہیئے۔

حسابی قواعد کے مطابق ۱۴ حروف کو 87178291200 یعنی تقریباً اٹھاسی ارب مختلف شکلوں میں ترتیب دیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان تمام ترتیبوں میں اس کا امکان تو بہت ہے کہ ہمیں کچھ بامعنی الفاظ مل جائیں، لیکن اس کا امکان بہت کم ہے کہ کسی ترتیب میں یہ حروف مسلسل بامعنی الفاظ بناتے جائیں، کوئی حرف نہ تو زائد ہو نہ کم پڑے، اور پھر

یہ الفاظ ایک ایسا جملہ بنا دیں جو قواعد کے اعتبار سے درست ہوتے ہوئے، مجموعی طور پر ایک قابل قبول مفہوم بھی دے۔ ایسا کوئی جملہ بنانے کے لئے غیر معمولی مستقل مزاجی، محنت اور عربی زبان پر عبور کی ضرورت ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود قرآن حکیم کے شیدائیوں نے کچھ محنت ضرور کی ہے اور اس طرح کچھ جملے حاصل بھی ہوئے ہیں۔ ان جملوں کی دریافت محض اتفاقی بھی ہوسکتی ہے اور محنت شاقہ کا نتیجہ بھی، لیکن قطع نظر اس بات کے کہ پہنچنے والے ان جملوں تک کیسے پہنچے ان کا تجزیہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

اس سلسلے میں ایک جملہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر کی پہلی جلد میں، سورہ بقرہ میں آنے والے حروف مقطعات الم پر بحث کرتے ہوئے درج کیا ہے۔ جملہ یہ ہے:

﴿نَصٌّ حَكِيْمٌ قَاطِعٌ لَّهٗ سِرٌّ﴾

اس جملے کے معنی کچھ اس طرح بنتے ہیں کہ صاحب حکمت کی طرف سے ہونے والی بات باقی ہر ایک کی بات کو رد کر دیتی ہے؟ حکمت والے کا قول سب پر بھاری ہے۔ اگر ہم یہ سمجھ لیں کہ یہاں حکیم سے ذاتِ پروردگار مراد ہے تو بات صاف ہے لیکن اس کے بعد کا ٹکڑا ''لَـهٗ سِرٌّ'' ''اس کا راز ہے''، بالکل بے ربط ہے۔ اس لئے کہ جس کے ارشاد یا عمل کو برہان قاطع کہا جا رہا ہو اسے راز قرار دینا بے محل اور بے ربط بات ہے۔ ہر دلیل کو رد کر دینے والی دلیل تو اظہر من الشمس ہوتی ہے، مبین ہوتی ہے، اگر دلیل خود راز ہو تو دوسروں کے دلائل کو رد کیسے کرے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ جملہ صرف اس لئے ترتیب دیا گیا ہے کہ اس کی مدد سے حروفِ مقطعات کو یاد رکھا جا سکے، اور علامہ ابن کثیر نے بھی اس جملہ کو صرف یہ کہہ کر درج کیا ہے کہ ''ان حروف سے یہ جملہ بنتا ہے''۔ اگر ان کا مقصد جملے کی معنویت پر زور دینا ہوتا تو وہ ضرور وضاحت کرتے۔

ایک اور جملہ ملاحظہ ہو۔ اسے دورِ حاضر کے نامور خطیب علامہ طالب جوہری

نے اپنی زیرِ تصنیف تفسیر، احسن الحدیث میں، کہیں سے پڑھ کر درج کیا ہے۔ جملہ یہ ہے:

﴿صَحَّ طَرِيقُكَ مَعَ السُّنَّةِ﴾

یعنی تیرا طریقہ سنت کے ساتھ صحیح ہے۔ اس جملے پر جناب طالب جوہری کے دو اعتراضات ہیں، اولاً یہ ایک بھونڈا جملہ ہے، ثانیاً اس میں یہ بھی واضح نہیں کہ **طريقك** کا مخاطب کون ہے۔ ان دو مضبوط خامیوں کے علاوہ ایک الجھن یہ بھی ہے کہ صحیح طریقے کا ایک جزؤ تو سنت ہوا لیکن دوسرا جزؤ کیا ہے، یہ پہلو بالکل تشنہ ہے۔ یعنی مخاطب اگر اپنے طریقے میں سنت کو بھی شامل کر لے تو اس کا عمل صحیح ہو جائے گا، لیکن سنت سے پہلے مخاطب کا طریقہ کیا تھا، اس کی طرف جملے میں کوئی اشارہ نہیں ہے۔

ایک اور اہم بات۔ اس جملہ میں لفظ **السنة** کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ اس لفظ سے ہم سنت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مراد لیں گے، کیوں کہ ہماری اصطلاح میں سنت سے مراد سنت رسولؐ لی جاتی ہے۔ لیکن یہ بات پیش نظر رہے کہ یہ ہماری وضع کردہ اصطلاح ہے، خدا اور رسولؐ کی نہیں۔ قرآن مجید نے جہاں جہاں بھی اس لفظ سنت کو استعمال کیا ہے، ہر جگہ اس کے لغوی معنی مراد لیئے ہیں، کسی ایک مقام پر بھی اس لفظ کو بطور اصطلاح نہیں برتا گیا۔ اور مزید دلچسپ بات یہ کہ قرآن حکیم میں یہ لفظ ۱۳ مقامات پر آیا ہے، لیکن کسی ایک جگہ بھی اسے جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ادا نہیں کیا گیا۔ سورہ ہائے انفال، حجر، کہف اور فاطر میں، چار مقامات پر ''**سنة الاولين**'' یعنی پہلے لوگوں کا راستہ کہا گیا ہے اور باقی نو جگہوں، سورہ اسراء اور سورہ غافر میں ایک ایک مرتبہ، سورہ احزاب میں تین جگہ، سورہ فاطر میں دو جگہ اور سورہ فتح میں دو مقامات پر سنت کا لفظ اللہ کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ اس طرح سنت کے لفظ سے سنت رسولؐ

مراد لینا ہماری اصطلاح تو ہے، قرآنی اصطلاح نہیں۔ اور اگر ہم قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے اسی طرح اپنے معنی پہنانے لگے تو بہت سے غیر سنجیدہ اور خلافِ متانت وتہذیب لطیفے بھی تفسیرِ قرآن کا درجہ حاصل کرلیں گے۔

اگر یہ کہا جائے کہ یہاں سنت کا لفظ بطور اصطلاح نہیں، بلکہ اپنے لغوی معنوں ہی میں آیا ہے، لیکن سـنـة سے پہلے ال لگا کر اسے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ تو میں عرض کروں گا کہ لغت میں سنت کے معنی بھی طریق یا راستے کے ہیں، تو اب جملے کا مطلب ہوگا کہ تیرا راستہ مع ایک خاص راستے کے صحیح ہے۔ جملے کی یہ شکل، ذوق لطیف پر گراں گزرنے کے علاوہ، کتنے اور مسائل پیدا کر دے گی، اس کا اندازہ صاحبانِ نظر بخوبی لگا سکتے ہیں۔

دو اور جملے

غرض دونوں جملے اپنی ساخت اور مفہوم کے اعتبار سے ایسے نہیں ہیں کہ انہیں حروفِ مقطعات کا حاصل کہا جا سکے۔ چنانچہ ان دونوں جملوں کو نہ تو مفسرین کی تحریروں میں پذیرائی مل سکی، نہ شہرت عام حاصل ہوسکی۔ البتہ دو اور جملے ہیں کہ اپنی دریافت سے لے کر آج تک اہل اسلام کے مختلف مسالک کے علماء میں، کسی نہ کسی حوالے سے توجہ کے مستحق سمجھے گئے ہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے، ان جملوں کی دریافت کا سہرا نامور شیعی عالم، علامہ شیخ محسن فیض الکاشانی (المتوفی ۱۰۱۹ھ مطابق ۱۶۱۰ء) کے سر ہے۔ ان کے دریافت کردہ ان جملوں کو شیعہ مفسرین نے، اپنی تفسیروں میں جگہ دی ہے اور خطباء اپنی تقریروں میں بیان کرتے ہیں، لیکن اہل سنت مفسرین نے بھی اس کا ذکر کیا ہے مثلاً نظام الدین نیشاپوری نے اپنی تفسیر لوامع التنزیل کی جلد اول صفحہ ۶۸ پر لکھا ہے کہ میں

نے یہ جملہ ایک شیعہ کی زبانی سنا ہے،''اگرچہ اس میں تکلف ہے لیکن چونکہ عجیب بات ہے اس لئے میں نے اسے یہاں نقل کر دیا ہے۔'' اسی طرح محمد عبدہ آلوسی مصری نے تفسیر المنار کی جلد اول کے صفحہ ۱۲۳ پر اس جملے کا ذکر کرتے ہوئے اسے ضعیف کہا ہے، اور یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ لوگوں نے اس جملے کے مقابلے پر اور بھی جملے تراشے ہیں۔ فاضل مصنف نے تراشے گئے کسی جملے کو درج نہیں کیا، غالباً وہ قابل ذکر نہیں تھے، لیکن علامہ کاشانی کے جملے پر ان کا واحد اعتراض یہ ہے کہ یہ جملہ ضعیف ہے۔ شاید زبان و بیان اور معنی کے اعتبار سے اس میں کوئی پہلو انگشت نمائی کا نہیں تھا۔ اور میں اپنی کم علمی کی وجہ سے اس جملے میں پائے جانے والے ''ضعف'' کو بھی سمجھنے سے قاصر ہوں، اس لئے کہ ضعیف اور قوی کی اصطلاحات کا تعلق روایت سے ہے، دریافت یا انکشاف سے نہیں۔ جناب علامہ کاشانی اگر اس جملے کو ارشاد رسالتؐ کے طور پر پیش کرتے تو اس نسبت کو ضرور ضعیف کہا جاتا۔ جب کہنے والا کسی قول کو اپنا قول کہہ رہا ہو تو قول کو صحت اور غلطی کے ترازو پر تولا جانا چاہیئے نہ کہ قوت اور ضعف کے معیار پر۔

علامہ کاشانی کے استخراج کردہ جملوں کو براہ راست بیان کرنے کی بجائے، میں استقرائی طریقہ کو ترجیح دوں گا۔ یعنی پہلے قرآن حکیم سے پوچھا جائے کہ اگر ہم حروف مقطعات سے کوئی جملہ بنانا چاہیں تو اس کی شکل کیا ہونی چاہیئے۔ اگر معیار مل گیا تو جملوں کے موزوں ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ خود بخود ہو جائے گا۔

قرآن حکیم کی رہنمائی

اس سلسلے میں گفتگو کرتے ہوئے بطور مقدمہ ایک اصول بیان کرنا ضروری ہے۔ یا یوں کہیے کہ پہلے وہ بنیاد معیّن کر دی جائے جس پر استدلال قائم کیا جا سکے۔

قرآن حکیم کی ترتیب من جانب اللہ و رسولؐ ہے۔ چنانچہ اس ترتیب میں بھی بہت سی حکمتیں ہیں۔ بلکہ بقول علامہ فخر الدین رازی ''جس طرح قرآن اپنے الفاظ کی فصاحت اور اپنے معانی کے شرف کے سبب معجزہ ہے، وہ اپنی ترتیب اور نظم آیات کے اعتبار سے بھی معجزہ ہے۔'' اس ترتیب کے کئی پہلو ہیں۔ ایک ترتیب تو آیات میں ہے۔ دوسری ترتیب سورتوں کی ہے۔ یعنی تفسیر قرآن کرتے ہوئے یہ بھی پیش نظر رہے کہ کسی آیت یا کسی سورۃ کا سیاق وسباق کیا ہے۔ اور اگر سیاق وسباق پر نظر ڈالی جائے گی تو معنی ومطالب کے نئے نئے گوشے سامنے آئیں گے۔ بعض مفسرین نے اس بارے میں کام کیا ہے۔ خصوصیت سے علامہ جلال الدین سیوطی نے اپنی معروف تصنیف الاتقان فی علوم القرآن کی دوسری جلد میں ایک پورا باب (باسٹھویں نوع۔ آیتوں اور سورتوں کی مناسبت) اسی موضوع پر قائم کیا ہے۔ اور متعدد علماء کے تائیدی بیان کے ساتھ اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ قرآن مجید کی ہر سورۃ کے اختتامیہ کا، اس کے بعد آنے والی سورۃ کے ابتدائیے سے گہرا ربط ہے، یہ ربط کہیں تو لفظی یا حرفی ہے، کہیں معنوی ہے۔ اس ربط کی مثالیں دیتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ ''سورۃ الواقعہ کا اختتام تسبیح کے حکم پر ہوا ہے، تو اس کے فوراً بعد سورۃ الحدید کا آغاز تسبیح سے ہوا ہے۔ یا پھر سورۃ البقرہ کا افتتاح ﴿الٓمّٓ ○ ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ کے ساتھ ہونے سے الصراط کی جانب اشارہ پایا جاتا ہے، جو کہ قول تعالیٰ ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ میں ہے۔ گویا جس وقت ان لوگوں نے صراط مستقیم کی جانب ہدایت کا سوال کیا تو اس وقت ان سے کہا گیا کہ جس صراطِ مستقیم کی جانب ہدایت دکھانے کی خواہش کرتے ہو وہ کتاب ہی ہے۔ اور یہ عمدہ معنی ہیں۔'' .... علامہ سیوطی کے بیان سے درج ذیل نکات حاصل ہوئے۔

۱۔ تمام سورتوں کے ماقبل اور مابعد کی سورتوں کا آپس میں ربط ہے۔

۲۔ سورہ الحمد اور سورہ بقرہ میں یہ ربط، پتہ پوچھنے اور پتہ بتائے جانے کا ربط ہے۔

۳۔ اس ربط کو دریافت کر لینے کے بعد جو معنی حاصل ہوتے ہیں وہ بہت عمدہ ہوتے ہیں۔

آیئے ان ہی درخشاں اصولوں کی روشنی میں ہم بھی سورہ حمد اور سورہ بقرہ کے باہمی ربط پر علامہ سیوطی کے کام کو آگے بڑھائیں۔ اور ان کی نشاندہی کو تسلیم کرتے ہوئے یہ دیکھیں کہ سورہ حمد میں کون سے صراط کی طرف ہدایت کے لئے سوال کیا گیا ہے اور سورہ بقرہ میں اس سوال کا کیا جواب دیا گیا ہے۔

سورۃ الحمد کی دعا

اس میں کوئی شک نہیں کہ سورۃ الحمد میں بندہ اللہ سے صراط مستقیم کی ہدایت مانگ رہا ہے۔ لیکن اس کی طلب صرف یہی نہیں ہے کہ اسے سیدھا راستہ مل جائے۔ اس کی طلب یہی ہوتی، یا اس کو راستہ بتا دینے سے ہدایت کا تقاضہ پورا ہو جاتا تو بات ﴿اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ﴾ پر ختم ہو جاتی۔ لیکن اللہ ہماری ضرورتوں کو ہم سے بہتر جانتا ہے۔ وہ آگاہ ہے کہ صرف راستے کا علم، کسی کو راہرو نہیں بنا سکتا۔ چنانچہ دعا آگے بڑھتی ہے کہ:

﴿صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ .... الخ﴾

صرف سیدھا راستہ نہیں بلکہ ان ہستیوں کا راستہ جن پر تیری نعمتیں نازل ہوتی رہیں۔ یوں تو کائنات کا ہر وجود اللہ کی نعمتوں سے فیضیاب ہوتا ہے۔ خود وجود کا ملنا ہی نعمت الٰہی ہے

اور اس اعتبار سے جمادات سے لے کر انسان کامل تک ہر وجود ﴿اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ﴾ ہے۔ لیکن جب صاحب انعام مخلوق کسی ﴿اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ﴾ کا راستہ دریافت کر رہی ہو تو یہ ایسے صاحب انعام ہونے چاہئیں کہ نہ ان کا قدم کبھی، ایک لمحہ کے لئے بھی، جادہ حق سے ہٹا ہو، نہ اللہ کی طرف سے ان پر بارانِ رحمت میں وقفہ آیا ہو اور نہ کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی وہ عتابِ الٰہی کے مصداق ہوئے ہوں۔ گویا ہمیں صرف راستے کا پتہ نہیں، بلکہ راستے کے نشان کے طور پر ان ہستیوں کی معرفت بھی درکار ہے جن کا ہر قدم صراطِ مستقیم کا پتہ دے رہا ہو۔

اور یہ پتہ پوچھ کر ہم کیا کریں گے؟ اس کا جواب جاننے کے لئے یہ دیکھیے کہ اس سے پہلے جو حقائق ہمیں معلوم ہوئے ان کے متعلق ہمارا رویہ کیا تھا۔ ہم نے سورۂ حمد پڑھتے ہوئے پہلے اللہ کی ربوبیت کا اقرار کیا، اس کی رحمت کو مانا، اس کی ملکیت کو تسلیم کیا۔ ان سارے اعترافات میں صرف ربوبیت کا اقرار ہی درحقیقت تین باتوں کا اعتراف تھا کہ وہی وجود عطا کرنے والا ہے، یعنی خالق و مالک ہے، وہی وجود کو قائم رکھنے کے اسباب فراہم کرنے والا ہے یعنی رازق ہے اور وہی وجود میں موجود امکانات کمال کو ابھارنے اور ترقی دینے والا ہے یعنی ہدایت دینا اس کا ہی کام ہے.........اب جب ہمیں اس کے خالق ہونے کا علم ہوا تو ہم نے کہا ﴿اِیَّاكَ نَعْبُدُ﴾ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ جب ہمیں اس کے رازق و مالک ہونے کی معرفت ہوئی تو ہم نے کہا ﴿وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ﴾ ہم اپنے ہر ذریعۂ وجود کو تجھی سے مانگتے ہیں۔ دو باتوں کی معرفت ہوئی تو ہم نے دونوں پر عمل پیرا ہونے کا اقرار کیا۔ تیسرا جزوِ ربوبیت تھا ہدایت۔ اب اگر صاحبانِ انعام ہستیوں کی معرفت ہو جائے اور ہم ان کے نقشِ قدم دیکھ کر صراطِ مستقیم کی معرفت حاصل کر لیں تو وہی کریں گے جو پہلی دو معرفتوں پر کیا تھا، یعنی

یہ اقرار کریں گے کہ ہم صاحبانِ انعام ہستیوں کی اس راہ پر چل رہے ہیں جو صراطِ مستقیم ہے۔

گویا سورہ الحمد اس دعا پر ختم ہوئی کہ اے ہمارے رب ہمیں اپنے انعام یافتہ بندوں کے ذریعہ سے سیدھے راستے کی ہدایت فرما دے تا کہ ہم یہ بھی کہہ سکیں کہ ہم انعام یافتہ لوگوں کی راہ مستقیم پر چل رہے ہیں۔

سورۃ البقرہ کا جوابِ دعا

ادھر دعا ختم ہوئی، ادھر سورہ بقرہ کا آغاز ہوا:

﴿الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾

الم۔ یہ وہ کتاب ہے جو ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ یہ صاحبانِ تقویٰ کے لئے سامانِ ہدایت ہے۔

ہماری دعا تھی کہ اے اللہ ہدایت دے، جواب ملا، لو! ہدایت موجود ہے لیکن شرط یہ ہے کہ پہلے متقی بنو پھر یہ، ہر شک سے بالاتر کتاب، تمہاری رہنمائی کر دے گی۔ (یہاں ضمناً سورۃ الحمد کی آیت ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ کے ترجمہ کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔ بحث یہ ہے کہ یہ سیدھا راستہ دکھانے کی دعا ہے یا سیدھے راستے پر ثابت قدم رہنے کی دعا ہے۔ تو جب ہدایت کے لئے پہلے متقی ہونے کو شرط قرار دیا گیا تو ظاہر ہے کہ متقی وہی ہوگا جو صراطِ مستقیم پر چلنے والا ہو۔ اور جب صراطِ مستقیم پر چلتے ہوئے دعا مانگی جائے گی تو ثباتِ قدم کی دعا ہوگی، راستہ دکھانے کی نہیں)۔

اب سوال یہ ہے کہ ہم نے تو ﴿اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ کا پتہ مانگا تھا لیکن جواب میں کتاب کی طرف بلایا گیا ہے۔ جس سے بہر طور ہماری دعا کی مکمل قبولیت نہیں ہوتی۔

دوسری بات یہ کہ دعا اور قبولیت دعا کے درمیان یہ **الم** کا جزو کیوں ہے۔ خدا کا کلام بے مقصد اور بے محل نہیں ہو سکتا۔ پھر بیچ میں حروف مقطعات کیوں ہیں؟ ان کی کچھ نہ کچھ علت ہونی چاہیئے۔ کیا ہمارے پاس کوئی دلیل ہے کہ ہم کسی کو یہ کہنے سے روک سکیں کہ ﴿ذٰلِكَ الْكِتَابُ﴾ (یہ کتاب) میں **ذالك** کا اشارہ پورے قرآن کی طرف نہیں، بلکہ ان حروف مقطعات کی طرف ہے جو سورۃ الحمد اور جوابِ دعا کے درمیان آئے ہیں۔ اس طرح مفہوم آیات یہ ہوگا کہ **الم** یا حروفِ مقطعات وہ بالائے شبہ کتاب ہیں، جن میں تمہاری دعا کا مکمل جواب موجود ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تسلیم کہ یہ محض ایک امکان ہے تو اس امکان کی صداقت کو پرکھنے میں کیا حرج ہے۔

حروفِ مقطعات میں صراطِ مستقیم

اب ہمارے پاس ۲۹ سورتوں میں آئے ہوئے حروف مقطعات ہیں۔ ان سے ایک مرتبہ سے زیادہ آنے والے حروف کے بعد باقی ماندہ ۱۴ حروف ہیں۔ ان حروف کو سامنے رکھیے۔

ا، ل، م، ر، ص، ط، س، ح، ی، ک، ھ، ع، ن، ق۔

ہمارا سوال تھا کہ ایسے سیدھے راستہ کا پتہ ملے جس کے نشانِ راہ صاحبانِ انعام ہستیاں ہوں۔ سوال کے جواب میں چار جزو ہونے چاہئیں، صراط، مستقیم، صاحبان انعام کا نام یا نشان، اس راستے پر چلنے کا عہد۔

اب جہاں تک لفظ صراط کا تعلق ہے تو اس لفظ کے چاروں حروف، ان ۱۴ حروف میں موجود ہیں۔

اب تلاش ہے لفظ مستقیم کی۔ لیکن یہ لفظ ان حروف میں آنا ممکن نہیں ہے اس

لئے کہ مستقیم میں دو میم ہیں، جب کہ ہمارے سامنے موجود حروف میں جتنے حرف ہیں سب صرف ایک ایک ہیں۔ علاوہ ازیں مستقیم کا تاء حروف مقطعات میں آیا ہی نہیں۔ تو مجبوراً ہمیں مستقیم کا مترادف تلاش کرنا پڑے گا۔ اور اس کے لئے زیادہ تگ و دو کی ضرورت نہیں، ایک لفظ ''حق'' ایسا ہے جو قرآنی بھی ہے اور اپنی معنویت کے سمندر میں پورے دین، پوری شریعت اور پوری فطرت کو سمیٹے ہوئے ہے۔ صراطِ مستقیم کے لئے صراطِ حق سے زیادہ موزوں اور درست مترادف نہیں ہوسکتا۔ اور جب باقی ماندہ ۱۰ حروف میں حق کے حروف دیکھیں تو حاء اور قاف دونوں موجود ہیں۔ چنانچہ ہماری دعا کے جواب میں دو حروف صراط اور حق ایسے مل گئے کہ یہ جزوِ دعا تھے۔ دوسری طرف ہمارے پاس مزید آٹھ حروف باقی ہیں۔

اب ہمیں دو اور امور درکار ہیں، ایک تو صاحبانِ انعام کے نام یا ان کی واضح شناخت اور پھر وہ رشتہ جو ان تین اجزاء کے ساتھ ہمارا ہے۔ تو صاحبانِ انعام کی تلاش کو مؤخر کیجئے، پہلے یہ دیکھ لیتے ہیں کہ ہمارا ربط کیا ہے۔ اگر بات صرف کسی راستے پر چلنے کی ہوتی تو ہمارا اور راستے کا باہمی تعلق چلنے، قائم رہنے یا طے کرنے کا ہوتا۔ لیکن یہاں اس راستے پر چلنا ہے جس پر صاحبانِ انعام چل رہے ہیں۔ تو جب راستے کی بجائے شخصیت پیش نظر ہو تو پھر راستہ طے نہیں کیا جائے گا بلکہ شخصیت کی پیروی ہوگی، اس سے منسلک ہوں گے یا اس کا ساتھ دیں گے۔ اس حوالے سے قرآن مجید اور احادیث میں تین لفظ بہت کثرت اور صراحت کے ساتھ آئے ہیں، اتباع، معیت، تمسک۔ ان میں سے معیت کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا تعلق صرف شخصیت سے ہوتا ہے، راستے پر چلنے کا مفہوم اس لفظ میں شامل نہیں۔ البتہ اتباع اور تمسک میں کسی شخصیت کی پیروی میں راستہ طے کرنے کا تصور پوری طرح موجود ہے۔ لیکن ان دو موزوں حروف میں سے اتباع تو

بالکل ممکن نہیں اس لئے کہ اس لفظ میں تاء جزوِ مادہ ہے، اس لئے اتباع کی کوئی شکل ہو اس میں تاء کا ہونا ضروری ہے جب کہ حروفِ مقطعات میں تاء شامل ہی نہیں۔ چنانچہ ہمارے پاس صرف تمسک کا لفظ باقی بچتا ہے، اور جب نعبد اور نستعین کے وزن پر تمسک سے فعل بناتے ہیں تو نمسکہ کا اخراج ہوتا ہے، اور حروفِ مقطعات کے باقی ماندہ آٹھ حروف میں نمسکہ کے تمام اجزاء مل جاتے ہیں۔ چنانچہ ہمیں اپنے سوال کے جواب میں نمسکہ کا ایک لفظ اور حاصل ہو جاتا ہے۔

حروفِ مقطعات کے ۱۴ حروف میں سے گیارہ صرف ہو گئے اور باقی تین حرف بچے۔ یہ حروف عین، لام اور یاء ہیں۔ اس سے لفظ بنتا ہے علی، جو ایک نام بھی ہے اور ایک پورے سلسلۂ ہدایت کا نقطۂ آغاز بھی۔

اب اسے حروفِ مقطعات کا معجزہ مانیے کہ ہمیں سورۂ حمد میں کیے گئے سوال کے جواب میں چار باتیں مطلوب تھیں، ان سب سے تعلق رکھنے والے چار موزوں ترین الفاظ حاصل ہو گئے اور حروفِ مقطعات کے چودہ کے چودہ حروف اس طرح استعمال ہوئے کہ نہ کوئی حرف باقی بچا اور نہ کوئی حرف دوبارہ استعمال ہوا۔ حاصل ہونے والے چار حروف صراط، حق، نمسکہ اور علی ہیں۔ ان حروف کو بامعنی ترتیب دیں، تو دو جملے بنے:

﴿صِرَاطُ عَلِیٍّ حَقٌّ نُمَسِّکُهُ﴾

علیؑ کا راستہ حق ہے ہم اس سے تمسک کرتے ہیں۔

﴿عَلِیٌّ صِرَاطُ حَقٍّ نُمَسِّکُهُ﴾

علیؑ حق کا راستہ ہیں ہم ان سے متمسک ہیں۔

ہماری دعا کے ہر پہلو کی قبولیت کا سامان ہو گیا۔ جسے صراطِ مستقیم کی تلاش تھی وہ علی علیہ السلام کے راستے پر آ جائے یہی حق کا راستہ ہے۔ اور جسے صاحبانِ انعام کی راہ اپنانی ہو وہ

علی علیہ السلام کے دامن سے وابستہ ہو جائے۔

یہ جملے لاکھ موزوں اور مناسب ہوں، ان جملوں کی دریافت کتنی ہی منطقی ہو، ہیں تو ہم انسانوں کے بنائے ہوئے۔ اس لئے یہ کسی کے لئے حجت نہیں ہو سکتے۔ البتہ اسے تائید خدا اور رسولؐ حاصل ہو تو پھر مستند ہیں۔ چنانچہ قرآن نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ صراطِ مستقیم وہی راستہ ہے جس پر صاحبانِ انعام چلتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ اگر مسلمان علی علیہ السلام کو ﴿اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ نہیں مانے گا تو اور کسے مانے گا۔ دوسری طرف زبانِ رسالتؐ نے ان دونوں جملوں کو ایک ہی ارشاد میں اس طرح جمع فرما دیا کہ حروفِ مقطعات سے بننے والے جملے ارشادِ نبویؐ کا نقش ثانی بن گئے۔ ارشادِ نبوتؐ بھی کوئی غیر معروف نہیں، کوئی ضعیف روایت نہیں، بڑوں بڑوں کی نقل کردہ، اور ان سے بھی بہت بڑوں کی روایت کردہ۔ جناب عبید اللہ امرتسری نے اپنی شہرۂ آفاق سیرت امیر المومنینؑ، ارجح المطالب میں الحق مع علی کے عنوان سے اس حدیث کو مختلف ماخذین سے جمع کیا تو انہیں تیرہ اصحاب ملے جنہوں نے یہ حدیث روایت کی۔ اور ان احادیث کا متن دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرتبہ نہیں، کئی مرتبہ، اور ایک موقعہ پر نہیں، کئی مواقع پر یہ ارشاد فرمایا کہ:

﴿عَلِيًّا مَعَ الْحَقِّ وَ الْحَقَّ مَعَ عَلِيٍّ لَنْ يَزُوْلا حَتّٰى يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْضِ﴾

علیؑ حق کے ساتھ ہیں اور حق علیؑ کے ساتھ ہے اور دونوں نہیں زائل ہوں گے حتیٰ کہ میرے پاس حوضِ کوثر پر پہنچیں۔

اب ہر صاحبِ نظر دیکھ سکتا ہے کہ علی علیہ السلام کا راستہ حق ہے اور حق کا راستہ علی علیہ السلام ہے یہ جملے حروفِ مقطعات سے نکلے تھے اور یہ جملہ زبانِ رسالتؐ سے نکل رہا ہے کہ حق

علی علیہ السلام کے ساتھ ہے اور علی علیہ السلام حق کے ساتھ ہے۔ دونوں جملوں میں کیا فرق ہے؟ ہر چند کہ کسی فرق کی نشاندہی کی گنجائش نہیں، لیکن کوئی محض سخن سازی کے طور پر کہہ سکتا ہے کہ حروف سے حاصل ہونے والے جملوں میں راستے کا ذکر ہے، اور ارشادِ نبوتؐ میں ایسا کوئی لفظ نہیں۔ تو اس سلسلے میں بلاغت قولِ رسولؐ دیکھئے کہ ارشاد ہوا یہ دونوں زائل نہیں ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض کوثر پر پہنچ جائیں۔ پہنچ جانے، وارد ہونے کا لفظ خود اس بات کی نشان دہی کر رہا ہے کہ جن کے کل حوض پر پہنچنے کی خبر سنائی جارہی ہے وہ آج یقیناً اس راہ پر گامزن ہیں جو انہیں منزل تک لے جانے کا ضامن ہے۔ اور یہی راہ صراطِ حق ہے اور یہی صراطِ مستقیم ہے۔

علی علیہ السلام کا حق سے دوطرفہ تعلق

حروفِ مقطعات کے اس معجزے کے ادراک کے لئے جہاں انصاف پسندی شرط ہے، وہاں باریک بین نگاہیں بھی درکار ہیں کہ حروفِ مقطعات سے چار لفظ بنے، ان کو ایک طرح سے ترتیب دیا تو جملہ عین حقیقت تھا، اور جب ترتیب الٹ دی تب بھی اس کی صداقت برقرار رہی۔ اس میں معجزاتی پہلو یہ ہے کہ اگر تذکرہ کسی اور کا ہوتا تو اس کے لئے ایک جملہ بن جانا کافی تھا لیکن یہ تذکرہ تھا علی علیہ السلام اور حق کا۔ اور جب حق کی کسی بھی شکل کا تذکرہ ہو، اور اس کی نسبت علی علیہ السلام کی ذات سے ہو تو ضروری ہے کہ نسبت کو پلٹ دیا جائے تب بھی قول درست رہے۔ اللہ کا رسولؐ حق کی ایک شکل ہے علی علیہ السلام سے نسبت دی گئی تو ارشادِ رسالتؐ ہوا۔ ﴿علی منی.........﴾ علیؑ مجھ سے ہے۔ لیکن ارشاد ختم نہیں ہوا جب تک جملے کو الٹ کر یہ نہ کہہ دیا گیا کہ ﴿انا منه﴾ علیؑ مجھ سے ہے اور میں علیؑ سے ہوں۔ (خصائص الامام امیر المؤمنین علیؑ بن ابی طالب از

حافظ احمد بن شعیب نسائی صاحب سنن نسائی)

اسی طرح قرآن بھی حق کی ایک صورت تھی ۔ اس کو بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی علیہ السلام سے ربط دیا تو یہ کہہ دینا بھی بہت بڑی فضیلت تھی کہ ﴿عَلِیٌّ مَعَ الْقُرْاٰنَ﴾ علیؑ قرآن کے ساتھ ہیں ۔لیکن بات علی علیہ السلام کی ہو رہی تھی اس لئے مکمل تب ہوئی جب ساتھ ہی یہ کہہ دیا گیا کہ ﴿وَ الْقُرْاٰنَ مَعَ عَلِیٌّ﴾ علیؑ قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن علیؑ کے ساتھ ہے۔

(مستدرک از امام حاکم نیشاپوری وصواعق محرقہ از علامہ ابن حجر مکی)

اب حق کی ایک اور شکل الصراط کا ذکر تھا تو حروفِ مقطعات نے اس صنعت کلام کو برقرار رکھا اور چار لفظ ایسے دیئے کہ وہی لفظ یہ کہیں کہ علی علیہ السلام کی راہ حق کی راہ ہے اور وہی الفاظ جگہ بدل لیں تو کہیں حق کی راہ ہی علیؑ ہے ۔گنتی کے کل چودہ حروف میں ، فضیلت علی علیہ السلام کے اس باریک پہلو کا اہتمام بھی موجود ہونا ، معجزہ نہیں تو اور کیا ہے۔

حروفِ اعجاز ٦

اعجازِ کتابت

حروفِ مقطعات کیا ہیں، اس پر بہت سے افراد نے بہت کچھ کہا۔ ہر حرف کے کچھ نہ کچھ معنی بیان کرنے سے لے کر تمام حروف کو بے معنی بھی کہا گیا۔ لیکن ان کے نزول کی مصلحت کے متعلق ایک بات، تھوڑے بہت الفاظ کے فرق کے ساتھ، تقریباً سب نے کہی کہ ان حروف کے ذریعہ کفار کو للکارا گیا ہے کہ یہی حروف ہیں جن سے تم کلام کرتے ہو، یہی حروف تمہارا ذریعہ اظہار ہیں اور ان ہی حروف سے قرآن مجید بنا ہے۔ اب اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ اللہ کا کلام نہیں اور اسے کسی انسان نے بنایا ہے، تو خام مال تو ایک ہی ہے، اور بقول تمہارے اس کو بنانے والا بھی تمہاری طرح کا انسان ہے، تو پھر دشواری کیا ہے، تم بھی اس جیسی کتاب لکھ لاؤ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن حکیم نے صاف لفظوں میں کفار سے قرآن حکیم کا جواب، بلکہ کسی ایک سورۃ کا جواب دینے کا مطالبہ کیا ہے اور یہ بھی پیشین گوئی کر دی ہے کہ کفار اپنے تمام مددگاروں کے ساتھ مل کر بھی کوشش کریں تو قرآن کا جواب نہیں دے سکتے۔ لیکن حروف مقطعات کے متعلق یہ کہنا کہ ان کو نازل کرنے کا مقصد وحید یہ ہے کہ کفار کو ان حروف کی مدد سے قرآن کا جواب دینے کے لئے للکارا جائے، ایک اہم سوال کا باعث بن رہا ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ حروفِ مقطعات کی کل تعداد ۱۴ ہے اور اس کے مقابلے میں عربی کے حروفِ تہجی کی کل تعداد ۲۸ ہے۔ یعنی حروفِ مقطعات ان

حروف کا نصف ہیں جن سے عربی زبان وجود میں آئی ہے۔ اب نہ تو اہل عرب صرف ۱۴ حروف میں کلام کرتے تھے، نہ قرآن مجید ہی فقط ۱۴ حروف سے وجود میں آیا ہے۔ حروفِ مقطعات سے زیادہ سے زیادہ لفظ قرآن نکالا جا سکتا ہے، لیکن جو کچھ قرآن کے اندر لکھا ہے وہ ۱۴ حروف سے نہیں، تمام ۲۸ حروف سے تشکیل دیا گیا ہے۔ تو ایسی صورت میں ان حروف کو یہ کہہ کر کیسے پیش کیا جا سکتا ہے کہ انہیں حروف میں تم بات کرتے ہو اور ان ہی میں قرآن نازل ہوا ہے۔ میری تمام تر تلاش کے باوجود اس سوال کا جواب کسی مفسر کی تفسیر میں نظر نہیں آیا۔

ہاں ایک امکان ہے کہ ان حروف کو مجازِ مرسل کے طور پر استعمال کیا گیا ہو۔ جیسے اور بھی بہت سے مقامات پر ہم صرف جزو کا تذکرہ کرتے ہیں لیکن ہماری مراد کل سے ہوتی ہے۔ جیسے کسی مرحوم کے ایصالِ ثواب کے لئے یہ کہا جائے کہ الحمد اور قل پڑھ لو۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں الفاظ سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص کا جزو ہیں، لیکن کہنے والے کی مراد پوری پوری سورتوں سے ہے۔ یہی قاعدہ بعض اوقات حروفِ تہجی کے سلسلے میں بھی استعمال ہوتا ہے، مثلاً یہ کہا جائے کہ بچہ تختی پر الف بے لکھ رہا ہے، تو ہماری مراد یہی ہوتی ہے کہ وہ حروفِ تہجی لکھنے کی مشق کر رہا ہے۔ اس قاعدے کو قواعد کی زبان میں مجازِ مرسل کہتے ہیں.......... تو جب یہ کہا جائے کہ حروفِ مقطعات سے عربی زبان بنی ہے یا قرآن بنا ہے تو مراد صرف ۱۴ حروف نہیں ہوں گے بلکہ تمام حروفِ تہجی ہوں گے۔ بات مناسب ہے، لیکن مجاز کے لئے جزو کا انتخاب کرنے کے بھی قاعدے ہیں۔ زیرِ بحث صورت میں عموماً ابتدائی جزو کو بطور مجاز منتخب کیا جاتا ہے۔ اور پھر مجازی جزو مستقل ہوتا ہے، یہ نہیں کہ کبھی اب ج مجاز ہو اور کبھی د ر ص مجاز بن جائے۔ جب کہ قرآن میں ۲۹ سورتوں میں ۱۴ حروف کے مختلف ٹکڑے استعمال ہوئے ہیں۔ اس لئے ان حروف کو

مجاز مرسل بھی نہیں کہا جاسکتا۔

اگر یہ بات صرف مسلمان علماء نے کہی ہوتی تو اس بات کا امکان تھا کہ ہم ان کے قیاس کو رد کر دیتے، لیکن کسی اور کے کہنے سے پہلے، انتہائی ذمہ دار ہستی، امام حسن عسکری علیہ السلام نے فرمایا کہ قریش اور یہود نے جب قرآن کی تکذیب کی تو اللہ نے حروفِ مقطعات نازل کیئے جن سے یہ بتلانا مقصود تھا کہ ان ہی حروف سے تم اپنا مافی الضمیر بیان کرتے ہو، اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو کہ قرآن اللہ نے نہیں اتارا اور یہ بندے کا کلام ہے تو تم بھی ان حروف سے قرآن جیسی کتاب لکھ لاؤ۔ (احسن الحدیث صفحہ ۱۵۸ بحوالہ تفسیر نور الثقلین جلد اول، صفحہ ۲۷)۔ اس ارشاد کی موجودگی میں ہمارے لئے اور زیادہ ضروری ہو جاتا ہے کہ یہ دیکھیں کہ قرآن مجید اور عربوں کی عام بول چال کس طرح ان ۱۴ حروف سے ممکن ہے۔

حروف کے اندازِ کتابت پر ایک نظر

اس سوال کا ایک ممکن جواب حروف کے لکھنے کے طریقے پر نظر ڈالنے سے ملتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہم اندازِ کتابت کا جائزہ لیں، پہلے یہ دیکھ لیں کہ کتابت یا حروف کی تحریر کے طریقے کی بنیاد پر قرآن فہمی کی کوئی کوشش جائز بھی ہوگی؟ یہ سوال اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ تحریر کے تمام طریقے انسان کے بنائے ہوئے ہیں۔ اور انسان کے بنائے ہوئے کسی قاعدے کی بنیاد پر اللہ کے کلام کو پرکھنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ البتہ یہ نامناسب بات اس وقت مناسب ہو جاتی ہے جب اللہ ہی کے کسی ارشاد سے ہمیں اس بات کی اجازت مل جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ہمیں قرآن حکیم میں ایک سے زیادہ واضح اشارے مل جاتے ہیں۔ پہلا اہم اشارہ تو سورۂ علق کی ان پانچ آیات میں موجود

ہے جو تاریخی اعتبار سے سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات ہیں۔ ان آیات میں سے ایک آیت ہے:

﴿الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ o عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ﴾

ہم نے اسے (انسان کو) قلم کے ذریعہ علم عطا کیا۔ ہم نے انسان کو وہ کچھ بتایا جسے وہ نہیں جانتا تھا۔

قلم کے ذریعہ علم دیا جانا تحریر کی اہمیت کی دلیل ہے۔ اور اگر ہم تحریر یا اندازِ تحریر کو بنیاد بنا کر کسی بات کا علم حاصل کرسکیں تو ہماری یہ کوشش ناروا نہیں ہوگی۔ لیکن خصوصی اعتبار سے حروفِ مقطعات کے سلسلے میں واضح تر بات سورہ ن والقلم میں ارشاد فرمائی گئی۔ سورہ کا آغاز ان آیات سے ہوتا ہے:

﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ﴾

نون اور قلم کی قسم اور قسم ہے اس کی جو لکھتے ہیں۔

یہاں مفسرین نے قلم اور تحریر کے متعلق بہت کچھ کہا ہے، ان کے ارشادات کم از کم اس وقت میرا موضوع نہیں ہے۔ مجھے تو صرف اس بات کی طرف توجہ دلانی ہے کہ ایک حرف مقطع کے فوراً بعد پہلے تو قلم کی قسم کھانا اور پھر اس کی قسم جو کچھ لکھتے ہیں، یا جو کچھ لکھا جاتا ہے۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ کیا لکھا جاتا ہے، کون لکھتا ہے بلکہ صرف اس کی قسم کھائی جارہی ہے جو تحریر میں آتا ہے۔ گویا یہاں صاف طور پر کہا جارہا ہے کہ اس نون کو (یا اس جیسے دوسرے حروف مقطعات کو) دیکھنے اور سمجھنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ تم ان کی کتابت دیکھو۔ یہ دیکھو کہ خود تم ان حروف کو کس طرح لکھتے ہو۔ اور ظاہر ہے کہ قرآن حکیم کے اس واضح اشارے کے بعد اگر حروفِ مقطعات میں، ان کی کتابت کے حوالے سے ان حروف کا کوئی غیر معمولی پہلو نمایاں ہورہا ہو، تو ہماری یہ تلاش حق بجانب ہی نہیں

ہو گی بلکہ منشائے قرآن کے عین مطابق ہو گی۔

حروف تہجی کی مکتوبی درجہ بندی

اگر ہم حروف کے لکھنے کے طریقے پر نظر ڈالیں تو پہلی بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ تمام حروف ایک قاعدے یا طریقے سے نہیں لکھے جاتے۔۔۔۔۔مثلاً باء لکھنا ہو تو یہ کسی حرف سے پہلے بھی مل سکتا ہے جیسے ''بقرہ'' میں، آخر میں بھی مل سکتا ہے جیسے ''کتب'' میں اور درمیان میں آئے تو اپنے سے پہلے اور بعد کے دونوں حروف سے مل جاتا ہے جیسے ''البیت'' میں۔ لیکن باء کی جگہ حرف **د** ہو تو اپنے سے پہلے حرف سے تو ملا کر لکھا جائے گا، جیسے ''بلد'' لیکن اگر اس کے بعد کوئی حرف آئے تو دال اس سے متصل نہیں ہوتا جیسے ''والدین'' میں **د** اپنے بعد آنے والی یاء سے الگ رہے گا۔

ا۔ الف

(ا) اب، ۲۸ حروفِ تہجی کو لکھنے کے مختلف طریقوں میں تقسیم کیجئے تو سب سے پہلے حرف الف آئے گا۔ یہ حرف کئی حوالوں سے منفرد ہے۔ دنیا کی تمام قدیم زبانوں میں الف کی آواز سب سے پہلی آواز ہے۔ اسی لئے کم و بیش ہر زبان کے حروف تہجی میں الف کو سب سے پہلا حرف قرار دیا گیا ہے۔ الف کی اولیت اور اس کے لکھے جانے کے امتیازی طریقے کو سامنے رکھتے ہوئے، اپنے عہد کے نامور خطیب اور بلند پایہ عالم جناب ابن حسن نونہروی نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا تھا:

> ''عرفاء کہتے ہیں کہ الف مقامِ وجود میں مظہر الوہیت ہے لیکن میں کہتے ہوں کہ مقام حدوث میں، عالم امکان میں الف مظہر مقام

محمدیتؐ ہے۔ وہاں یہ وحدت کی علامت ہے یہاں ابتداء کی علامت ہے۔ سب حرفوں کا سرنامہ حرف، چنانچہ ایک طرف ﴿اول ما خلق اللّٰہ نوری﴾ کا مظہر یہی الف ہے، دوسری طرف ﴿لولاک لما خلقت الافلاک﴾ کا مظہر بھی یہی الف ہے۔''

کیا شانِ استقامت ہے کہ ہر حرف سے ملتا ہے لیکن کبھی کج نہیں ہوتا، کسی کے سامنے جھکتا نہیں، کسی کے آگے خم نہیں ہوتا۔

کسی حرف سے مل کر اپنی شکل نہیں بدلتا۔ ہر حال اس کا ایک سا، ہر کیفیت یکساں

ہر حرف سے ملنے کو تیار ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ جسے ملنا ہے، آ کر قدموں سے ملے۔ اگر کوئی بے ادب قدم بوسی کے لئے آمادہ نہ ہو تو قیامت تک الف اسے قریب نہ آنے دے گا دور رہے اور دور رہ کر تڑپتا رہے۔

سارے حروف ملیں تو قدموں سے ملیں، لیکن اگر الف خود الف سے ملنا چاہے تو اسے شانوں پر چڑھا لیتا ہے۔

اے الف! یہ کیا؟ سب حرف شکایت کریں گے کہ ہمیں قدموں میں گرایا، اسے سر چڑھایا۔ تو الف جواب دے گا، تم بیگانے تھے، یہ یگانہ ہے، جگر جگر ہے، دگر دگر ہے۔

اور ملنے والا الف، ہے تو الف ہی، لیکن یہ پاس ادب

ہے کہ چھوٹا بن گیا ہے، بڑا الف نہ ہو تو یہ مکمل الف، ہو بہو وہی
الف، لیکن جب تک بڑے کے حضور میں ہے، ادب و احترام سے
چھوٹا بنا ہوا ہے۔ اس احترام بزرگی نے یہ مقام عطا کیا کہ بڑے
الف نے اسے اٹھا کر اور اونچا، اپنے سے بھی اونچا کر دیا۔
لیکن اس الف کا بھی ظرف دیکھیں کہ بڑے الف سے
اونچا ہو کر بھی بلندی دینے والے سے آگے نہیں بڑھا، اپنے کو چھوٹا
ہی رکھا۔''

غرض الف اپنے اندازِ تحریر میں بالکل منفرد ہے، جیسے کوئی اور حرف الف کی طرح نہیں لکھا جاتا۔

۲۔ باء، تاء، ثاء نون

باء کے طرزِ تحریر کے متعلق پہلے عرض کیا جا چکا۔ یہی کیفیت تاء، ثاء اور نون کی ہے۔ ممکن ہے یہاں حرفِ نون کی موجودگی خلاف توقع ہو، لیکن یہ بات پیشِ نظر رہے کہ ہم ان حروف کی مکتوبی درجہ بندی کر رہے ہیں۔ چنانچہ یہ نہ دیکھیئے کہ کوئی حرف، تہجی ترتیب میں کہاں واقع ہے بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ کون کون سے حروف مکتوبی اعتبار سے یکساں ہیں۔ اور اس اعتبار سے نون اور باء میں سوائے نقطے کے مقام کے، بہ اعتبار تحریر کوئی فرق نہیں ہے۔ اور یہی صورت تاء اور ثاء کی ہے۔

۳۔ جیم، حاء، خاء (ج، ح، خ)

یہ تین حروف یوں تو اپنے ماقبل اور مابعد سے متصل ہو جاتے ہیں، لیکن ان کو

ایک مخصوص انداز سے لکھا جاتا ہے، اور ان میں باہمی امتیاز کا واحد ذریعہ نقطوں کا مقام ہے۔

۴۔ دال، ذال، را، زاء، واؤ (د، ذ، ر، ز، و)

یہ پانچ حروف صرف اپنے سے پہلے حرف سے ملتے ہیں، بعد والے سے نہیں۔ علاوہ ازیں ملتے وقت اپنی اصلی شکل کو برقرار رکھتے ہیں۔ یہاں بھی واو، حروف کی فہرست میں، باقی چار حروف سے کافی فاصلے پر ہے لیکن اپنی مکتوبی شکل کے اعتبار سے باقی چار حروف کے مماثل ہے۔

۵۔ سین، شین (س، ش)

یہ دونوں حروف اپنے تین شوشوں کی وجہ سے دوسرے حروف کے مقابلے میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور باہمی طور پر ان میں صرف نقطوں کا فرق ہے۔

۶۔ صاد، ضاد (ص، ض)

ان دونوں حروف کا طرز تحریر ایک ہے، صرف نقطے کا وجود یا عدم وجود ان میں امتیاز پیدا کرتا ہے۔

۷۔ طاء، ظاء (ط، ظ)

یہ دونوں حروف بھی شکل میں دوسرے حروف سے مختلف، لیکن دونوں بالکل یکساں انداز سے لکھے جاتے ہیں، اور ان دونوں کا باہمی فرق بھی صرف نقطے کا فرق

ہے۔

۸۔ عین، غین (ع، غ)

یہ حروف بھی دوسروں سے مختلف، لیکن باہمی طور پر یکساں انداز سے لکھے جاتے ہیں۔اور ان کا باہمی فرق بھی نقطے کا ہونا یا نہ ہونا ہے۔

۹۔ فاء، قاف (ف، ق)

ان دونوں کی مکتوبی شکل ایک ہے، امتیاز یہ ہے کہ ایک پر ایک نقطہ ہے اور دوسرے پر دو نقطے ہیں۔

۱۰ تا ۱۲۔ کاف، لام، میم، ہاء (ک، ل، م، ہ)

یہ چاروں حروف الگ الگ شکل رکھتے ہیں، چاروں کو اپنے پہلے اور بعد کے حروف سے ملایا جا سکتا ہے۔لیکن دوسرے حروف سے مل کر بھی ان کی شکل منفرد ہی رہتی ہے۔

۱۳۔ یاء

عربی زبان میں یاء وہ واحد حرف ہے جو بیک وقت نقطہ دار بھی ہے اور بے نقطہ بھی۔ جب کسی حرف سے پہلے یا درمیان میں آتا ہے تو باء جیسے شوشے کے نیچے دو نقطوں سے ظاہر کیا جاتا ہے، لیکن اگر یہی لفظ حروف کے آخر میں آئے تو بغیر نقطے کے لکھا جاتا ہے۔

حروفِ تہجی اور حروفِ مقطعات

اب یہ خاصی دلچسپ بات ہے کہ مکتوبی اعتبار سے جب ۲۸ حروف تہجی کی درجہ بندی کی گئی تو سارے حروف ۱۴ اقسام میں منقسم ہوئے۔ لیکن اس سے بھی دلچسپ اور حیران کن انکشاف اس وقت ہوتا ہے جب ہم ۱۴ حروف مقطعات کو ان اقسام میں تلاش کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے: حروفِ مقطعات کا الف پہلی قسم میں آتا ہے، نون دوسری قسم میں، حاء تیسری میں، راء چوتھی میں، سین پانچویں میں، صاد چھٹی میں، طاء ساتویں، عین آٹھویں، قاف نویں قسم میں۔ اور اس کے بعد دسویں سے چودھویں تک پانچ حروف مفرد بھی ہیں اور منفرد بھی۔ چنانچہ یہ پانچ کے پانچوں حروف، یعنی کاف، لام، میم، ہاء اور یاء، حروف مقطعات میں موجود ہیں۔ گویا حروف مقطعات یونہی اٹھائے گئے کچھ حروف نہیں، بلکہ پورے حروفِ تہجی کے تمام طریقہ ہائے تحریر کی مکمل نمائندگی کرتے ہوئے حروف ہیں، اور وہ بھی اس اہتمام سے کہ نہ کسی قسم کو چھوڑا گیا، نہ کسی قسم سے ایک سے زیادہ نمائندہ حرف لیئے گئے۔

اور پھر یہ نمائندگی بھی باقاعدہ قانون کے تابع ہے۔ اوپر کی ۱۴ اقسام میں سے دو اقسام ایسی ہیں کہ جن کے تمام ارکان نقطہ دار ہیں۔ یہ دوسری، یعنی باء، تاء، ثاء اور نون پھر دسویں قسم یعنی فاء اور قاف ہیں۔ باقی تمام اقسام یا تو بے نقطہ ہیں، یا اس قسم میں ایک بنیادی حرف بغیر نقطے کے ہے اور باقی ارکان پر نقطہ ہے۔ اب حروفِ مقطعات کا اہتمام دیکھیئے کہ جہاں سارے ارکان نقطہ دار تھے وہاں کی نمائندگی نقطہ دار حرف ہی کر سکتے تھے۔ چنانچہ دوسری قسم میں نون کا انتخاب ہوا، اور دسویں قسم سے قاف کا انتخاب ہوا، اور اس کے بعد بغیر استثناء کے ہر قسم سے صرف بے نقطہ حرف کو چنا گیا۔ یہ باقاعدگی، یہ حسن

انتخاب، یہ اہتمام اور تئیس (۲۳) سال کے مختلف اوقات میں الگ الگ نازل ہونے والے حروف میں یہ نظم وضبط ایک جیتا جاگتا معجزہ نہیں تو اور کیا ہے۔

چنانچہ حروفِ مقطعات میں حروفِ تہجی کی تمام بنیادی شکلوں کی مکمل نمائندگی موجود ہے، اور اب ان حروفِ مقطعات پر صرف نقطہ بڑھاتے جایئے، ایک نقطے کے استعمال سے پورے حروف تہجی حاصل ہو جائیں گے۔ گویا اگر نقطہ شامل ہو جائے تو پورا قرآن مجید بھی حروفِ مقطعات سے وجود میں آیا ہے اور پوری عربی زبان بھی ان ہی حروف سے تشکیل پاتی ہے۔

اور اب اس ارشاد امیر المومنین علیہ السلام پر نظر دوڑایئے کہ میں بائے بسم اللہ کا نقطہ ہوں۔ گویا کہا جا رہا ہے کہ اگر علی علیہ السلام کو قرآن سے الگ رکھو گے تو قرآن محض بکھرے ہوئے مجرد حروف ہیں، اور اگر علی علیہ السلام کو قرآن سے منسلک رکھو گے تو حروف بڑھ کر پورا قرآن بن جائیں گے۔ اسی بات کو ایک اور طرح سے دیکھیئے۔ قرآن مجید نے ارشاد کیا، کہ اس میں کچھ آیات محکم ہیں اور کچھ متشابہ ہیں۔ محکم آیات وہ ہیں جن کا مفہوم اپنے طور پر واضح ہو اور متشابہ وہ ہیں جن کو واضح کرنے کے لئے کسی تاویل کی ضرورت ہو، جنہیں سمجھنے کے لئے کسی اور حوالے کی ضرورت پیش آئے۔ اب اگر محکم اور متشابہ کی اس تعریف کی روشنی میں حروف کو دیکھا جائے تو تمام بے نقطہ حروف محکم حروف ہیں، جیسے الف، لام، میم وغیرہ، کہ ان حروف کی شناخت میں کوئی دشواری نہیں ہے۔ لیکن نقطہ دار حروف اپنی شناخت کے لئے نقطہ کے محتاج ہیں، ج اور خ میں نقطہ ہوگا تو یہ جیم اور خاء بنیں گے۔ اب جو جناب امیر علیہ السلام نے فرمایا کہ میں باء کا نقطہ ہوں تو اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہوگا کہ قرآن کے متشابہات، متشابہات ہی رہیں گے اگر ان کی حقیقت کو جاننے کے لئے علی علیہ السلام سے رجوع نہ کیا گیا۔

حروفِ مقطعات اور اسمائے اہل بیتؑ

حروف مقطعات کے تمام اعجازی پہلوؤں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے ہر اعجاز کا کوئی نہ کوئی ربط اہل بیتؑ سے بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔ ان حروف کی عددی حیثیت ہو، ان سے بننے والا جملہ ہو، ان میں بتایا گیا صراطِ مستقیم کا پتہ ہو، ان میں نقطے کی اہمیت ہو، غرض کوئی پہلو اب تک ایسا نہیں ملا جو اہل بیتؑ کی طرف نہ لے جاتا ہو۔ اب ہم نے ان حروف کی مکتوبی صورت پر گفتگو کی ہے، تو کیا اپنی تحریری شکل میں بھی یہ حروف، اہل بیتؑ سے کوئی مناسبت رکھتے ہیں؟ آیئے اس سوال کا جائزہ لیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسمائے پنجتنؑ ۱۲ حروف سے مل کر بنے ہیں۔ ان بارہ میں سے دس حروف، م، ح، ع، ل، ی، ا، ط، ہ، س، ن تو بالکل وہی ہیں جو حروفِ مقطعات میں ہیں۔ صرف دو حرف ایسے ہیں جو حروفِ مقطعات میں نہیں۔ یہ دو حرف دال اور فاء ہیں۔ لیکن خوبی یہ ہے کہ یہ دو حرف کسی ایک مکتوبی قسم کے حروف کی تکرار نہیں ہیں، بلکہ حروف کی جس قسم سے، حروفِ مقطعات میں راء لیا گیا تھا، اسی سے اسمائے پنجتنؑ میں دال کا حرف لیا گیا۔ اور جس قسم سے قاف منتخب ہوا تھا، اسی سے فاء کا انتخاب ہوا۔ اس طرح جو اصل انتخاب حروفِ مقطعات میں کارفرما تھا وہی حروف اسمائے اہل بیتؑ میں برتا گیا یعنی ہر مکتوبی قسم سے ایک ایک حرف کا انتخاب، اور نقطہ دار حروف کے مقابلے میں ان حروف کا انتخاب جو بے نقطہ ہوتے ہوئے، بنیادی حیثیت رکھتے ہوں۔

ہاں اسمائے پنجتنؑ میں کل بارہ حروف ہونے کی وجہ سے دو مکتوبی شکلوں کی نمائندگی نہیں ہو سکی یہ دو حروف صاد اور کاف ہیں۔ لیکن اس نمائندگی کے نہ ہونے کے باوجود، اسمائے اہل بیتؑ کے تمام حروف، حروف مقطعات کی مکتوبی صورت سے مکمل

مطابقت رکھتے ہیں ۔ یہی بات ان دونوں کی لفظی اور معنوی تعلق کی دلیل ہے ۔

ایک دلچسپ اتفاق

اب ذرا بظاہر ایک غیر متعلق بات دیکھ لیجیے ۔ قرآن نے (سورۂ احزاب ۳۳ آیت ۵۶) میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ایک حکم دیا:

﴿یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا﴾

اے ایمان والو نبیؐ پر صلواۃ بھیجو اور انہیں اس طرح سلام کرو جیسے حق تسلیم ہے ۔

اب ان دونوں امتیازات میں سے ، جہاں تک سلام کا تعلق ہے تو قرآن حکیم نے خود بھی کئی دوسرے انبیاء پر سلام بھیجا ہے ، اور ہم بھی جب کسی نبی کا نام لیتے ہیں تو علیہ السلام کہتے ہیں ۔ اور دوسری طرف جب صلواۃ کی بات ہو تب بھی قرآن حکیم نے گروہ صابرین کو مستحق صلواۃ قرار دیا ہے چنانچہ سورۂ بقرہ (آیات ۱۵۶ و ۱۵۷) میں ارشاد ہوا:

﴿اَلَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلَیْھِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَرَحْمَةٌ ۔ وَاُولٰٓئِكَ ھُمُ الْمُھْتَدُوْنَ﴾

وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ ہم سب اللہ کی طرف سے ہیں اور ہمیں اسی کی طرف واپس پلٹنا ہے ۔ ان پر ان کے رب کی طرف سے صلواۃ ہے ، رحمت ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں ۔

ان دونوں امتیازات میں سے سلام میں تو اور انبیاء نے حضورؐ کے ساتھ شرکت کی لیکن جہاں تک صلواۃ کا تعلق ہے ، تو یہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے مخصوص

ہو گیا۔ ضروری قرار پایا کہ جب آنحضور کا اسم گرامی لیا جائے تو آپ پر صلواۃ بھیجی جائے ۔یعنی صلواۃ کے الفاظ آنجناب کے لئے مخصوص ہیں۔ ان الفاظ کو کسی اور کے لئے استعمال کرنا شاید اصولاً یا قانوناً جرم نہ ہو، لیکن بے ادبی ضرور ہے۔ ہم کسی اور نبی، امام، شہید، یا صابر کو صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں کہہ سکتے۔

اسی طرح حضرت علی علیہ السلام کے لئے تعظیماً کئی جملے اختیار کیئے گئے۔ بلکہ یہ امتیاز ہے جناب امیر کا کہ اصحابِ رسول میں سب کے لئے ایک جملہ بنا، رضی اللہ عنہ، لیکن حضرت علی علیہ السلام کو کبھی رضی اللہ عنہ کہا گیا، کبھی علیہ السلام کہا گیا اور کبھی کرم اللہ وجہہ کہا گیا۔ (گویا فضائل علی علیہ السلام کی نوعیت ایسی تھی کہ کسی ایک جملے میں سمیٹے ہی نہ جا سکے) ان تمام جملوں میں ہر ایک علی علیہ السلام سے درست نسبت رکھتا ہے۔ جو چاہے کہیئے۔ لیکن جب رضی اللہ عنہ کہا تو ان الفاظ کا استعمال تمام اصحاب اور اہل بیت علیہم السلام کے لئے مشترک تھا۔ جب علیہ السلام کہا تو تمام انبیاء اور اہل بیت اس اندازِ خطاب میں حصہ دار تھے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ رضوان و سلامتی کے مقابلہ میں کرامت وہ اعزازِ عام تھا کہ بقولِ قرآن ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ﴾ (سورۂ بنی اسرائیل: ۱۷-۷۰) اللہ نے انسان کو مکرم بنایا لیکن جب تاجِ کرامت رکھنے کے لئے کسی حقیقی مکرم ذات کی تلاش ہوئی اور کرم اللہ وجہہ بطورِ خطاب کہا تو پوری دنیا میں علی علیہ السلام کے سوا کوئی اور کبھی اس خطاب سے پکارا نہیں گیا۔ اس جملے کی ایک اور خصوصیت تھی کہ اور خطاب تو ہم عقیدت مندوں کی طرف سے اظہارِ عقیدت کے طور دیئے گئے تھے، لیکن کرم اللہ وجہہ کا خطاب زبانِ رسالت نے اعلانِ حقیقت کے طور پر خاص حضرت علی علیہ السلام کے لئے ارشاد فرمایا تھا۔ اس جملے کا مفہوم تھا کہ اللہ نے علی علیہ السلام کے چہرے کو مکرم کیا، بزرگی عطا کی۔ یہ اعتراف، یہ اعلان اس حقیقت کا اعلان و اعتراف تھا کہ علی علیہ السلام کا سر سوائے اللہ کے کبھی

کسی غیر کے سامنے نہیں جھکا۔ غرض زبانِ رسالتؐ پر جاری ہونے والا جملہ ''کرم اللہ وجہہ'' علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا منفرد اعزاز قرار پایا۔

اب ذرا غور فرمایئے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام آئے تو صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہیے، اس جملے میں کوئی اور آپؐ کا شریک نہیں، علی علیہ السلام کا نام نامی آئے تو احترام کا کوئی جملہ کہیے لیکن کرم اللہ وجہہ میں کوئی ان کا شریک نہیں۔ اب نام لکھیئے تو حضورؐ کے نام نامی پر کم از کم ایک ''ص'' بنا دیجیے، امام علی علیہ السلام کے اسم مبارک پر ''ک'' یا کرم لکھ دیجیے۔ حضورؐ کے ساتھ صلی اللہ کی خصوصی نسبت، علی علیہ السلام کے ساتھ کرم اللہ کی خصوصی نسبت۔ ایک کا حرف آغاز **ص** ہے، دوسرے کی ابتداء حرف **ك** سے ہوتی ہے۔ حروفِ مقطعات چودہ تھے، حروف اسمائے پنجتن علیہم السلام بارہ تھے۔ حروفِ مقطعات کے تمام حروف، اسمائے پنجتن علیہم السلام میں موجود تھے۔ صرف دو حروف کی کمی تھی، ایک **ص** اور دوسرا **ك**۔ اب اسے اتفاق کہیے یا انتظامِ قدرت کہ صلی اللہ اور کرم اللہ کو نبیؐ و علیؑ سے مخصوص کر کے یہ کمی بھی پوری کر دی گئی۔ اور یہ واضح کر دیا گیا کہ قرآنِ صامت ہو یا قرآنِ ناطق، دونوں کی اصل ایک ہے۔

حروفِ اعجاز......۷

اسمِ اعظم

حروفِ اعجاز کی تمہیدی گفتگو میں عرض کیا جا چکا ہے کہ قرآن حکیم جہاں اپنے اندازِ بیان اور حروف کے اعتبار سے معجزہ ہے، جہاں اس کی فصاحت و بلاغت معجزہ ہے، جہاں اس کے بیان کردہ حقائق معجزہ ہیں، وہاں اس کا ایک معجزاتی پہلو اس کی سورتوں، آیات، الفاظ اور حروف کی غیر معمولی تاثیر اور ان کا روحانی اثر ہے۔ چنانچہ حروف مقطعات، جزوِ قرآن ہوتے ہوئے، اور اپنے دامن میں پورے قرآن کو سمیٹے ہونے کے حوالے سے خود بھی عجیب روحانی تاثیر رکھتے ہیں۔ اور اب ہمارا موضوعِ سخن ان حروف کی یہی حیران کر دینے والی تاثیر ہے۔

لیکن حروفِ مقطعات کے اس معجزے پر کچھ کہنے سے پہلے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ زبان و بیان کا کوئی معجزہ ہو، اعداد و حساب کے اعتبار سے کوئی اعجاز ہو، حقائق و واقعات کے حوالے سے کوئی بیان معجز نما ہو، یا کوئی معجزاتی عمل ہو، ان تمام اقسام پر گفتگو کرتے ہوئے ہم دلائل و شہادت میں منطقی استدلال کا سہارا لیتے ہیں، لیکن جب کبھی کسی چیز کی تاثیر زیرِ بحث ہو تو منطقی دلائل کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ تاثیر ہمیشہ مشاہدے سے ثابت ہوتی ہے۔ اگر یہ دعویٰ ہو کہ اسپرین میں درد کو دور کرنے کا اثر ہے یا نہیں، تو اس کا ثبوت زبانی دلائل سے نہیں ہوگا، بلکہ یہی کہا جائے گا کہ اس دوا کا اثر دیکھنا ہے تو کسی درد میں مبتلا مریض کو اسپرین کھلا کر دیکھ لیں، خود معلوم ہو جائے گا کہ اثر

ہے یا نہیں .... جب یہ کہا جائے کہ حروفِ مقطعات غیر معمولی روحانی اثرات رکھتے ہیں تو یہ توقع نہیں ہونی چاہیے کہ اس بات کو دلائل سے ثابت کیا جائے گا، بلکہ یہی کہا جائے گا کہ جسے تاثیر پر شک ہو وہ ان حروف کو عملاً آزما کر دیکھ لے۔ چنانچہ اب ہماری گفتگو یا تو ایسی کسی تاثیر کے امکان سے متعلق ہوگی، یا پھر ان حروف سے تعلق رکھنے والے کچھ خصوصی اثرات کا ذکر ہوگا۔

حرف و بیان کی تاثیر

دنیا میں ایک ذات سے کسی دوسری ذات تک اثرات منتقل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ آواز ہے۔ اکثر و بیشتر حیوان اپنی جبلی تقاضوں کو مخصوص آوازوں سے ہی ظاہر کرتے ہیں۔ انسان تک پہنچ کر یہ آوازیں بیان بن جاتی ہیں۔ اور اسی بیان کی دولت نے انسان کو دوسرے حیوانوں سے ممیز اور ممتاز بنا دیا ہے۔ انسان کی ساری ترقی اور دوسری مخلوقات پر بالادستی کا بڑا ذریعہ یہی قوت گویائی ہے۔ خصوصیت سے اثر کے حوالے سے دیکھا جائے تو خوشی ہو یا غم، بزدلی ہو یا جرأت، شکست ہو یا فتح، دل تنگی پیدا کرنی ہو یا فراخدلی کا جذبہ ابھارنا ہو، کسی کو راحت پہنچانی ہو یا اسے غصہ دلانا ہو، غرض یہ سب الفاظ ہی ہیں جو جذبات کی دنیا میں تحریک بھی پیدا کرتے ہیں، اور اشتعال کو سرد بھی کرتے ہیں۔ کہیں ایک لفظ کی ادائیگی سے انسان بھڑک اٹھتا ہے، اور کبھی ایک لفظ بگڑی کو بنا دیتا ہے۔ انسانی زندگی سے لفظ نکل جائیں تو انسان اپنی ذات میں گھٹ کر رہ جائے، نہ معاشرہ قائم رہے، نہ خاندان۔ فرد کو جماعت بنانا، اور جماعت کو معاشرے میں ڈھالنا الفاظ ہی کا کام ہے۔

اور یہ تو صاحب عقل و شعور انسان تھا، لفظوں کو معنی دے بھی سکتا تھا اور آواز

کے مفہوم کو سمجھ بھی سکتا تھا، لیکن بے جان مادہ بھی آواز سے اثر قبول کرنے میں دیگر مخلوقات سے پیچھے نہیں رہا، وہ ایک دھماکے کی آواز ہی تھی جس نے ہیروشیما کی عظیم الشان عمارتوں کو خاک میں ملا دیا۔ اور آج انسان کتنے دروازے محض آواز سے کھولتا ہے، بچے کتنے کھلونوں کو چٹکی بجا کر، تالی کی آواز سے، شور مچا کر حرکت دیتے ہیں۔

ادھر نظام قدرت کا یہ عالم ہے کہ (مجازاً سہی) ایک ''کُن'' کی آواز کائنات تخلیق کر دیتی ہے، ایک ہولناک آواز سدوم میں آباد قوم لوطؑ کو عذابِ الٰہی کا شکار کر دیتی ہے، اور صور اسرافیل ایک آواز ہی ہوگی جو جیتی جاگتی دنیا کو موت کی وادیوں میں پہنچا دے گی، اور وہ بھی ایک آواز ہی ہوگی جو مُردوں کو حیاتِ نو دے کر میدانِ محشر میں کھڑا کر دے گی۔

گویا آواز یا دوسرے لفظوں میں حرف وہ طاقت ہیں جو صرف ذی حیات ہی کو نہیں، مردہ مادے کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ اور معاملہ قلب و دماغ کو متاثر کرنے کا ہو یا موجودات کی بے حس و شعور شکلیں ہوں، یہ سب آواز، حروف یا الفاظ کی کسی نہ کسی صورت سے اثر قبول کرتے ہیں۔

اسم اعظم

جب حروف مادے اور ذہن دونوں پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں، تو کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی حرف، لفظ یا الفاظ ایسے بھی ہوں جو بیک وقت ہر ذہن، اور مادے کی ہر صورت پر اثر انداز ہو سکیں؟ عقلاً، جب مختلف الفاظ میں تاثیر موجود ہے تو پھر کسی ہمہ گیر اثر رکھنے والے حرف کی موجودگی خارج از امکان نہیں ہوگی۔ اس غیر معمولی تاثیر رکھنے والے امکانی لفظ کو اسم اعظم کا نام دیا گیا ہے۔

اصطلاحی طور پر اسم اعظم، اللہ کے اسمائے حسنہ میں سے ایک لفظی نام ہے کہ جو اس سے واقف ہو جائے گا، اس کی، اس اسم کے ذریعہ ہر حاجت پوری ہو سکے گی۔ اس لفظ میں یہ عجیب تاثیر پوشیدہ ہے کہ جب اسے خاص ترتیب و ترکیب سے ادا کیا جائے تو غیر معمولی اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔

(اسم مستاثر۔ صفحہ ۳۲ از آیت اللہ محمدی گیلانی)

اسم اعظم کی موجودگی پر قرآن کی گواہی

عقلی طور پر کسی چیز کا ممکن ہونا ہرگز اس بات کا ثبوت نہیں کہ وہ شے حقیقتاً موجود بھی ہے۔ کیا کوئی قابل یقین اور نا قابل تردید شہادت ایسی موجود ہے جو ہمیں اسم اعظم، یا یوں کہیے کہ کسی ایسے لفظ کے وجود سے آگاہ کرے جو ناممکن کو ممکن بنا دینے کی صلاحیت رکھتا ہو؟.......... اس سلسلے میں قرآن مجید سے بڑھ کر کوئی اور مستند ذریعہ نہیں، جو ایسے کسی لفظ، اسم یا حرف کے وجود کی تصدیق یا تردید کر سکے۔ چنانچہ ہمیں سب سے پہلے قرآن حکیم سے پوچھنا چاہیئے، وہ ایسے کسی لفظ کے متعلق کیا کہتا ہے۔

قرآن مجید، جو خود الفاظ کا مجموعہ ہے، اپنی تاثیر کے متعلق کہتا ہے:

﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ﴾ (سورۃ الحشر ۵۹ آیت ۲۱)

اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر نازل کرتے تو تم دیکھتے کہ خوف الٰہی سے پہاڑ عاجزی سے پھٹ جاتا۔

اس آیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن حکیم میں (کم از کم بوقت نزول) اتنی قوت ہے کہ مادے کی بہت بڑی مقدار یعنی پہاڑ بھی اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے

پہاڑ پر رونما ہونے والا یہ اثر قرآن کے الفاظ کی بجائے خشیت الٰہی کا نتیجہ قرار دیا جائے، اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ خود قرآن حکیم نے اس کیفیت کو اللہ کے خوف کا ہی ثمر قرار دیا ہے۔ لیکن یہ بھی تو دیکھیے کہ یہ خشیت الٰہی خود نزولِ قرآن سے پیدا ہوئی ہے۔ گویا قرآن کے الفاظ میں یہ اثر ہے کہ وہ خالص مادی وجود میں بھی اللہ کا خوف اور عاجزی پیدا کر سکتے ہیں۔

ایک اور مقام پر قرآن اپنی عظمت اور جلالت کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

﴿وَ لَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُیِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِیْعًا﴾

(سورۃ الرعد ۱۳ آیت ۳۱)

اور اگر کوئی قرآن ایسا ہے جس سے پہاڑ چلائے جاتے، یا اس سے زمین (آناً فاناً) قطع کی جاتی یا اس کے ذریعہ سے مردوں سے باتیں کرائی جاتیں (تو وہ یہی ہے) لیکن ہر قسم کا اختیار اللہ ہی کو ہے۔

اس ارشاد میں قرآن حکیم کے روحانی اثرات کے مزید امکانات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ پہاڑوں کو اپنی جگہ سے حرکت دینا، فاصلوں کو چشم زدن میں طے کر لینا اور عالم ارواح سے رابطہ پیدا کر لینا یہ سب غیر معمولی اثرات ہیں اور انہیں نزولِ قرآن کے خصوصی مرحلے کی خصوصیت نہیں، بلکہ قرآن حکیم کی مستقل صفت کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

﴿قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِیْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْكَ طَرْفُكَ. فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ﴾ (سورۃ النمل ۲۷، آیت ۴۰)

اس نے کہا جو کتاب کا تھوڑا سا علم رکھتا تھا کہ میں اسے آپ کے پاس لے آتا ہوں قبل اس کے کہ آپ کی نگاہ جھپکے۔ اور اس کے ساتھ ہی جب انہوں (سلیمانؑ) نے اس (تخت) کو اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا تو کہا یہ میرے پروردگار کے فضل سے ہے۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ کتابِ الٰہی کا تھوڑا سا علم وہ کام کر سکتا ہے جو جنوں کی تمام تر قوت کے باوجود ان کے بس سے باہر تھا۔ ممکن ہے کہ کسی کو گمان ہو کہ یہاں علم کتاب سے مراد کتاب کی کوئی روحانی طاقت نہ ہو بلکہ کوئی ایسا طبعی (یا آج کی اصطلاح میں سائنسی) طریقہ ہو، جسے جان لینے کے نتیجے میں صاحب علم کے لئے یمن کے شہر سبا سے، فلسطین کے شہر بیت المقدس تک جانا اور پھر بمعہ تخت و تخت نشین کے واپس آنا ممکن ہو گیا ہو۔ تو ہر چند کہ بیانِ قرآن میں ایسا فرض کرنے کا کوئی قرینہ نہیں ہے کہ یہ سب کچھ کسی آلہ، کسی مشین کے ذریعہ ہوا۔ لیکن اگر ایسا مان بھی لیا جائے تو قرآن کے مطابق یہ طریقہ بھی علم کتاب سے ہی حاصل ہوا تھا۔ اور اس کے ساتھ یہ ایسا راز تھا کہ جو کتاب میں موجود ہونے کے باوجود ہر کس و ناکس کی دسترس سے باہر تھا۔ تو اب چاہے تخت بلقیس کسی طبعی قوت سے آیا ہو یا کسی روحانی قوت سے، جو بھی قوت رہی ہو اس کا ماخذ الفاظ کتاب ہی تھے۔ گویا کتاب یعنی قرآن میں ایسے الفاظ موجود ہیں جو ناممکن کو ممکن بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

واقعہ کی وضاحت کیلئے ایک مثال

قرآن مجید میں اس وضاحت سے واقعہ بیان ہونے کے بعد ایک مسلمان کے لئے ممکن نہیں ہے کہ وہ اسم اعظم یا غیر معمولی اثر پیدا کر سکنے والے حروف یا الفاظ کے

وجود سے انکار کر سکے، لیکن اگر تسکین قلب کے لئے کوئی اس واقعہ کی عقلی توجیہہ حاصل کرنا چاہے تو اس کے لئے یہ مثال کافی ہوگی کہ ایک تاریک کمرے میں کوئی شخص روشنی کرنا چاہے تو ہر چند کہ کمرے میں برقی بلب بھی ہے اور بلب تک پہنچنے والی تاروں میں برقی رو بھی، لیکن روشنی کا حاجت مند لاکھ دیواروں کو تھپتھپائے، لاکھ ادھر ادھر ہاتھ مارے لیکن جب تک سوئچ بورڈ تک نہ پہنچے گا، روشنی ممکن نہیں ہوگی۔ اور سوئچ بورڈ تک پہنچ جانا ہی کافی نہیں ہے۔ بورڈ پر تو بہت سے بٹن لگے ہیں، روشنی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس خاص سوئچ کو دبائے جس کا تعلق بلب تک برقی رو پہنچانے سے ہے۔ اب ظاہر ہے کہ روشنی کا خواہش مند اگر اجنبی ہوگا تو غیر ضروری طور پر ہاتھ پیر مارتا رہے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ تمام تر کوشش کے باوجود متعلقہ سوئچ تلاش نہ کر سکے۔ لیکن دوسری طرف کمرے کی ہر چیز سے واقفیت رکھنے والا، اندھیرے کے باوجود سیدھا بورڈ تک جا کر مطلوبہ بٹن دبا دے گا اور بغیر کسی تردد کے روشنی ہو جائے گی.......... چنانچہ ہم قرآن حکیم کے بیان کردہ واقعے کو یوں سمجھ سکتے ہیں کہ عام لوگ کلامِ الٰہی کے وجود سے تو واقف تھے لیکن ان کو نہیں معلوم تھا کہ اس میں موجود کون سا لفظ فاصلے طے کرنے کا ذریعہ ہے اور کس لفظ کی مدد سے تختِ بلقیس کو منگوایا جا سکتا ہے۔ جسے اس راز کا علم تھا اس کے لئے یہ سب کچھ فقط چشم زدن میں کر دینا ممکن تھا۔

آصف بن برخیا کا تھوڑا سا علم

روایات سے پتہ چلتا ہے کہ علم کتاب کا یہ معجزہ دکھانے والے، حضرت سلیمان علیہ السلام کے قریبی عزیز آصف بن برخیا تھے۔ اصول کافی میں ایک روایت امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل کی گئی ہے اس کے مطابق اسمائے اعظم کی کل تعداد ۷۳ ہے۔ (اصول

کافی، جلد اول، باب ما اعطی الائمہ من اسم الاعظم، روایت ۱، صفحہ ۲۳۰) ان تمام اسماء کا مکمل علم کسی کو عطا نہیں کیا گیا انبیائے ماسبق میں ان حروف سے آگہی کی تقسیم اس طرح سے تھی کہ

حضرت آدم علیہ السلام	کو	۲۵
حضرت نوح علیہ السلام	کو	۱۵
حضرت ابراہیم علیہ السلام	کو	۸
حضرت موسیٰ علیہ السلام	کو	۴
حضرت عیسیٰ علیہ السلام	کو	۲

اسمائے اعظم کا علم عطا کیا گیا۔ آصف بن برخیا جو اپنے تھوڑے سے علم کتاب پر تخت بلقیس کو سینکڑوں میل کا سفر آنکھ جھپکنے کی مدت میں طے کرا سکتے تھے انہیں فقط ایک اسم اعظم تعلیم ہوا تھا۔ امام علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اللہ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو، اوران کی وساطت سے ہم اہل بیتؑ کو، ان اسمائے اعظم میں سے ۷۲ اسماء کا علم عطا کیا اور صرف ایک اسم کو اللہ نے اپنی ذات تک محدود رکھا۔

پوری کتاب کا علم

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے اس ارشاد سے پہلے قرآن مجید اس تقسیم کے متعلق، اپنے مخصوص اندازِ بیان میں، خبر دے چکا تھا:

﴿وَ يَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَسْتَ مُرْسَلًا . قُلْ كَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا ، بَيْنِي وَ بَيْنَكُمْ وَ مَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ﴾

(سورۃ الرعد ۱۳، آیت ۴۳)

اور وہ لوگ کافر ہوگئے، کہتے ہیں کہ آپ (اللہ تعالیٰ کے) بھیجے
ہوئے نہیں ہیں۔ تو آپ کہہ دیں کہ میرے اور تمہارے درمیان
اللہ تعالیٰ کافی گواہ ہے اور وہ (بھی) جس کے پاس ہر کتاب کا علم
ہے۔

اس سے پہلے حضرت سلیمان علیہ السلام کے تذکرے میں ارشاد ہوا تھا کہ آصف بن برخیا کو علم کتاب میں سے محض تھوڑا سا علم (علم من الکتاب) دیا گیا تھا۔ اس آیت سے پتہ چلا کہ جسے اللہ نے، اپنے رسول کی رسالت کی گواہی کے لئے، اپنے ساتھ منتخب کیا ہے، اسے کتاب کے جزو کا نہیں، پوری کتاب الٰہی یا تمام کتابوں کا علم (**عِندَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ**) عطا کیا ہے۔ اب یہ سوچنا ہمارا کام ہے کہ ایک اسم اعظم کا علم اتنی قدرت رکھتا ہے کہ آن کی آن میں ملکہ سبا کو اس کے تخت سمیت یمن سے فلسطین منتقل کر دے، تو جن کے پاس ممکن حد تک تمام اسمائے اعظم کا علم ہو، وہ کس قدرت اور طاقت کے مالک ہوں گے۔ گویا ایک در خیبر کی کیا حقیقت ہے، یہ ضرورت سمجھیں گے تو سورج کو بھی پلٹا سکیں گے۔

اصول کافی کی مذکورہ روایت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہر اسم اعظم کا دائرہ کار محدود اور مخصوص ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ۷۳ اسمائے اعظم کی ضرورت نہیں تھی، نیز اس بات سے بھی کوئی فرق نہ پڑتا کہ کسی ہستی کے پاس کتنے اسماء کا علم ہے۔ اس لئے کہ ہر اسم اعظم کا دائرہ اثر لامحدود ہوتا تو ایک اسم کے علم سے بھی وہی اثرات ظاہر ہوتے جو ۷۲ اسماء سے ہویدا ہوتے اور پھر اس بات میں بھی کوئی فرق نہ ہوتا کہ کسی کو کتاب کا تھوڑا علم دیا گیا ہے اور کسی کو پوری کتاب کا عالم بنایا گیا ہے.........اور جب ہر اسم کا حلقۂ تاثیر الگ الگ ہے تو جس کو جتنے زیادہ اسماء کا علم ہوگا، اسی اعتبار سے اس کے اختیار میں

اضافہ ہوتا جائے گا۔ ہم نے قرآن کے ذریعہ آصف بن برخیا کے ایک اسم اعظم کے علم کا فقط ایک مظاہرہ دیکھا، ہم نہیں جانتے کہ ان کا علم ابھی اور کون کون سی انہونیوں کو جنم دے سکتا تھا۔ تو جب ہم فقط ایک اسم کی قوت کا اندازہ نہیں لگا سکتے تو ان کے علم کی وسعتوں اور طاقتوں کی حدیں مقرر کرنا، حماقت کے سوا اور کیا ہوگا، جن کو ۷۲ اسماء کا علم عطا کیا گیا ہے۔

حروفِ مقطعات اور اسم اعظم

اسم اعظم کے بارے میں اس ابتدائی بحث کی ضرورت یوں پیش آئی کہ بہت سے علماء کا کہنا ہے کہ اللہ کا اسم اعظم قرآن مجید کے حروفِ مقطعات میں پوشیدہ ہے۔ اس سلسلے میں کئی امکانات کی بھی نشاندہی کی گئی ہے، مثلاً راوی حدیث جناب سعید بن جبیر شہید کہتے ہیں کہ ''حروفِ مقطعات کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم وہ ہے کہ جن کی ترکیب کی کیفیت سے ہم واقف نہیں، اور اسم اعظم انہیں کے درمیان ہے۔ اور دوسری قسم وہ ہے جس کی ترکیب سے ہم واقف ہیں، جیسے ''راء''، ''حم'' اور ''ن'' کہ جن کو ملانے سے رحمان بنتا ہے، لیکن اسم اعظم اس قسم میں نہیں۔''

(بحوالہ اسم مستاثر۔ آیت اللہ محمدی گیلانی، صفحہ ۴۴)

علماء کی قیاس آرائیاں اور اندازے اپنی جگہ، ہمارے لئے حروفِ مقطعات کے تاثیری معجزے کی طرف متوجہ ہونے کے لئے، سلسلۂ امامت کی چھٹی فرد، امام جعفر صادق علیہ السلام کا یہ ارشاد کافی ہے کہ ''**الم** (اور دیگر حروفِ مقطعات) اللہ کے اسم اعظم کے حروف میں سے حرف ہیں، جو قرآن مجید میں جدا جدا بیان ہوئے ہیں۔ نبیؐ اور امامؑ جب انہیں مرکب کر کے دعا مانگتے ہیں تو مستجاب ہوتی ہے۔'' (تفسیر انوار القرآن، صفحہ

۱۳۔بحوالہ تفسیر البرہان، جلد ۱، صفحہ ۴۴۳ و تفسیر احسن الحدیث، صفحہ ۱۵۹۔بحوالہ تفسیر نور الثقلین، جلد اول، صفحہ ۲۶)

اسم اعظم اور اجابتِ دعا میں ربط

اس روایت میں حروفِ مقطعات کی تاثیر کا واضح ذکر تو ہے ہی، لیکن ضمناً ایک سوال کا جواب کچھ امکانی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لئے ضروری ہے۔ اور وہ یہ کہ اس روایت سے ایک تأثر یہ ملتا ہے کہ نبی اور امام کی دعا کی قبولیت کا سبب ان کا بارگاہِ الٰہی میں تقرب نہیں بلکہ اسم اعظم کا سہارا ہے۔ یعنی دعا کی قبولیت سے نہ دعا کا تعلق ہے، نہ دعا کرنے والے کا، بلکہ یہ فقط ایک حیران کن اسم تھا کہ جس کو زبان پر لاتے ہی دعا قبول ہوگئی۔ یعنی اسم اعظم الف لیلیٰ کی داستان کا ''کھل جا سم سم'' ہے کہ اس سے غرض نہیں کہ ان الفاظ کو ادا کرنے والا کون ہے، کسی بھی زبان سے یہ لفظ ادا ہوئے اور خزانے کا منہ کھل گیا؟

اس سوال کا جواب بہت زیادہ توازن فکر کا طالب ہے، اس لئے کہ دوٹوک لفظوں میں ہم ہاں یا نہیں کہہ کر اس سوال کا جواب نہیں دے سکتے۔ اگر قبولیت دعا کو صرف اسم اعظم کا کرشمہ کہیں تو نہ صرف یہ کہ دعا مانگنے والے کی شخصیت کی عظمت کی نفی ہوتی ہے بلکہ اس عمل پر دعا کے لفظ کا اطلاق ہی بے معنی ہو جاتا ہے۔ جس کیفیت کو ہم قبولیت دعا کہہ رہے ہیں اگر وہ اسم اعظم کی لازمی تاثیر ہے۔ تو ایسی صورت میں دعا مانگی جائے یا محض اسم اعظم پڑھ کر اپنی خواہش کا اظہار کر دیا جائے، اسم اعظم میں موجود تاثیر کا تقاضا ہے کہ ہمارے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ ضرور حقیقت بن جائیں۔ پھر دعا مانگنے کا تکلف بھی کیوں؟.......... دوسری طرف اگر یہ کہا جائے کہ قبولیت دعا کا سبب، طلب دعا

کرنے والے کی شخصیت کا تقربِ الٰہی ہے۔ تو اس کے مقربِ الٰہی ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ وہ اگر اپنے رب سے کچھ مانگے تو اس کی تمنا پوری ہو۔ ایسی شخصیت کو کسی خاص اسم کا سہارا لینے کی کیا ضرورت ہے؟

اللہ نے اس دنیا کو دنیائے اسباب بنایا ہے۔ یہاں پر رونما ہونے والی ہر بات اپنے ہونے کا سبب رکھتی ہے، اور جب کسی خاص کیفیت کا پیدا کرنا مقصود ہو تو ضروری ہے کہ پہلے اس کیفیت کے لئے جو اسباب مقرر ہیں، انہیں فراہم کیا جائے۔ اگر سر کا درد دور کرنا ہے اور اللہ نے اس درد کے لئے کسی خاص غذا کو سبب قرار دیا ہے تو اس غذا کی فراہمی ضروری ہوگی۔ اب غذا فراہم کرنے سے پہلے ضروری ہوگا کہ ہمیں علم ہو کہ کس خاص چیز کو درد کی دوا بنایا گیا ہے۔ اور اگر ہم خود یہ علم نہ رکھتے ہوں تو اس سے دریافت کرنا ہوگا جو یہ علم رکھتا ہے۔ اس طرح درد کے مداوا کے لئے تین شرطیں پوری کرنا ہوں گی۔ اولاً صاحب علم سے رجوع کرنا، دوم اس سے علاج دریافت کرنا اور تیسری شرط اثر رکھنے والی دوا کا استعمال۔ ان میں سے کوئی ایک شرط پوری نہ ہو تو علاج ممکن نہیں ہوگا۔ اب دعا بھی اپنے مسائل کو حل کرنے کی آرزو ہے۔ یقیناً ہمیں جو مسئلہ درپیش ہے اس کا کوئی نہ کوئی حل موجود ہے۔ ہم اس حل سے آگاہ نہیں ورنہ دعا کی ضرورت ہی نہ پیش آتی۔ ایسے موقع پر کسی ایسی ہستی کی ضرورت ہوگی جو ہمارے مسئلے کے حل سے آگاہ ہو، دوا کے معاملے میں ہم اس سے رجوع کرتے ہیں جو دوا کے اثرات سے واقف ہو۔ چنانچہ دعا کے لئے اس عالم کی ضرورت ہوگی جو دعا کے اثرات کو جانتا ہو۔ اب جہاں تک دعا کا تعلق ہے، اسے اللہ کی بارگاہ میں پیش ہونا ہے۔ چنانچہ عالم بھی ایسا درکار ہوگا جو بارگاہِ الٰہی میں قبولیت دعا کے اسباب سے آگاہ ہو۔ جانتا ہو کہ کن الفاظ میں اور کس طریقے سے مانگی گئی دعا کو قبولیت کا شرف حاصل ہو سکتا ہے یہ علم انہیں کو حاصل ہوگا جو

اللہ کی بارگاہ میں تقرب رکھتے ہوں اور جنہیں اللہ کی طرف سے وہ علم خاص دیا گیا ہو، جس کا تعلق قبولیت دعا سے ہے۔ چنانچہ اللہ سے براہ راست علم حاصل کرنے والے جب دعا مانگیں گے تو ان کی دعا کا طریقہ بھی بہترین ہوگا اور جن الفاظ میں دعا مانگیں گے وہ الفاظ بھی دعا کے لئے بہترین ہوں گے۔

اس بات کو یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ دنیا میں اگر ایک حاکم کی کئی حیثیتیں ہوں تو سوال کی نوعیت کے اعتبار سے خطاب بدل جائے گا۔ ضلع کا سربراہ بیک وقت انتظامیہ کا بھی سربراہ ہے، تعلیمی اداروں کا بھی نگران ہے، کچھ عدالتی اختیارات بھی رکھتا ہے، قانون کا نفاذ بھی اس کی ذمہ داری ہے، اہل ضلع کی صحت کا بھی نگران ہے اور حکومت کی طرف سے زمین کا مالیہ بھی وہی وصول کرتا ہے۔ اب ہم بخوبی جانتے ہیں کہ ہمیں ان تمام میں سے جس شعبہ سے بھی کوئی غرض وابستہ ہو، ہمیں اپنی درخواست کو ایک ہی شخصیت تک پہنچانا ہے، لیکن کام کی نوعیت کے اعتبار سے جب ہم درخواست لکھیں گے تو خطاب میں اس مخصوص شعبے کا حوالہ دیں گے جس سے ہماری غرض کا تعلق ہے۔ کبھی درخواست ڈپٹی کمشنر سے ہوگی، کبھی ڈپٹی کلکٹر سے، کبھی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے اور کبھی کسی بورڈ کے چیئرمین سے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہم جو کام کروانا چاہتے ہیں، اس کو کروانے کے لئے درخواست دینے کا طریقہ بھی معیّن ہو، ممکن ہے درخواست کسی مخصوص فارم پر دینی ہو، کسی خاص زبان کی بھی قید ہو، درخواست میں بہت سی باتوں کی تفصیل دینا بھی ضروری ہو، کسی بات کی تصدیق بھی کرانی ہو۔ اب ظاہر ہے کہ جو ان تمام مراحل سے پوری طرح آگاہ ہے وہ درخواست تیار کرے گا تو تمام امور کا خیال رکھے گا۔ اور اگر ناواقف ہے تو اس کی درخواست ان نتائج کو حاصل نہیں کر سکے گی جس کے لئے درخواست لکھی گئی ہے۔ گویا دعا کے لئے اسم اعظم کا حوالہ دینا اس لئے نہیں ہے کہ دعا

کرنے والا تقربِ الٰہی سے محروم ہے۔ بلکہ اس طرح دعا مانگنا خود اس بات کی دلیل ہوگا کہ دعا کرنے والا، اپنے تقرب کی وجہ سے، بارگاہِ الٰہی کے آداب سے پوری طرح واقف ہے۔

پھر یہ بھی خیال رہے کہ نبی اور امام امت کے لئے نمونۂ عمل ہیں۔ اللہ نے انہیں ان کا منصب اسی لئے دیا ہے کہ اللہ جو کچھ اپنی مخلوق سے چاہتا ہے، یہ ہستیاں اس منشائے الٰہی کو عملی طور پر کرکے دکھا دیں۔ نمونۂ عمل ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ جن حالات میں جو کچھ کریں گے وہی ان حالات میں درست اور مطلوبہ طریقہ کار ہوگا۔ جس طرح اپنی روزمرہ کی زندگی کے لئے ہم ان سے آداب سیکھتے ہیں، اس سے کہیں زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان سے اللہ کی عبادت کے طریقے سیکھیں۔ اور دعا بھی عباداتِ الٰہی میں ایک افضل و اعلیٰ عبادت ہے۔ چنانچہ ان ہستیوں کا فریضہ ہے کہ وہ ہمیں آدابِ دعا تعلیم کریں اور یہ ہماری خوش بختی ہوگی کہ ہم اس طرح، اور ان الفاظ میں دعا مانگیں، جس طریقے سے، اور جن الفاظ میں ان ہستیوں نے دعا کی ہے۔

یہی جواز ہے اس بات کا کہ مسنون دعائیں کیوں پڑھی جائیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دعا ہر انسان کی بالکل ذاتی عبادت ہے، ہر انسان کو پوری آزادی ہے کہ اپنے رب سے جب چاہے، جو کچھ چاہے، جس زبان میں چاہے، جس طرح چاہے، اپنے رب سے دعا کرے۔ پھر دعائے کمیل ہو، دعائے امام زمانہ علیہ السلام ہو، دعائے امام زین العابدین علیہ السلام ہو یا قرآن میں بیان کی گئی انبیاء علیہم السلام کی دعائیں ہوں۔ ان سب کو پڑھنے کی ضرورت کیا ہے؟ یہی ناں! کہ یہ ان ہستیوں کی دعائیں ہیں، جن کو آدابِ دعا آتے تھے۔ ان کے علم کا لازمی نتیجہ ہے کہ جس طرح انہوں نے دعا کی ہے، دعا کرنے کا اس سے بہتر انداز ہو ہی نہیں سکتا۔ انداز بھی بہترین، الفاظ بھی موزوں

ترین، وقت بھی مناسب ترین۔ اس لئے جب ہم دعا کے لئے ہاتھ اٹھائیں تو بہترین کی موجودگی میں، کسی کم تر انداز کو کیوں اختیار کریں۔ اگر سب سے اچھے طریقے تک رسائی تھی تو کم تر کا انتخاب ہماری کوتاہی بھی ہوگا، کم فہمی بھی، اور ممکن ہے گستاخی بھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دعا کوئی منتر نہیں ہے کہ اسے پڑھا اور مطلوبہ خواہش پوری ہوگئی۔ دعا کی قبولیت کے لئے اس کا دل سے نکلنا ضروری، مانگنے والے کا تضرع اور بے قراری لازمی، جو کچھ زبان سے کہہ رہا ہے اس سے قلب و ذہن کی ہم آہنگی ضروری، لیکن اس کے ساتھ ساتھ الفاظ وطریقہ کا موزوں اور مناسب ہونا بھی ضروری۔ اس لئے مناسب ترین بات یہی ہوگی کہ جس حاجت کے لئے جو دعا مسنون ہو، اس وقت وہی پڑھی جائے، لیکن الفاظ کے معنی ومفہوم سے آگاہی کے ساتھ۔ تاکہ وہ تمام عوامل جمع ہو جائیں جن کے ساتھ قبولیت دعا مشروط ہے۔

ان تفصیلی حاجتوں کے بعد، حروفِ مقطعات کے روحانی اثرات کے بارے میں یہ روایت، قابل فہم بھی ہوگی اور ہماری دشواریوں میں ایک کارآمد اور حلِ مشکلات نسخہ بھی کہ امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام جب کسی سخت اور دشوار مہم سے دوچار ہوتے تھے تو اپنی دعا کا آغاز سورۂ مریم اور سورۂ شوریٰ کے حروفِ مقطعات کے ساتھ حرف ندا لگا کر کرتے تھے یعنی ﴿یا کھیعص یا حم عسق﴾ کہہ کر دعا مانگتے تھے۔ اب اس بحث سے کوئی فائدہ نہیں کہ یہ حروف اسم اعظم ہیں یا نہیں، اس روایت سے یہ تو بہرطور ثابت ہوگیا کہ اولاً حروف کے یہ دونوں مجموعے اسمائے الٰہی ہیں، اور ثانیاً مشکل مرحلوں میں ان حروف کو اسی ترتیب سے پکارا جائے تو مشکل کا حل ہونا یقینی ہوگا۔

حل مشکلات کیلئے ایک درود خاص

حروفِ مقطعات کی تاثیر کے متعلق گفتگو اختتام کو پہنچی۔ جب یہ طے ہوگیا کہ

یہ حروف اپنے دامن میں تاثیری معجزہ بھی رکھتے ہیں تو اب یہ کام ہے تلاش کرنے والے کا کہ کس حرف میں اللہ نے کون سی تاثیر رکھی ہے۔ ائمہ علیہم السلام سے جن حروف کی جو خصوصیت نقل ہوئی ہے وہ ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ ان کے علاوہ عملیات اور اوراد سے دلچسپی رکھنے والوں نے اپنے تجربے کی بنیاد پر متعدد اور حروف کے اثرات دریافت کئے ہیں۔ لیکن چونکہ ایسے تمام وظائف اور عمل کسی معصوم کی سند نہیں رکھتے، اس لئے ان کا بیان ذمہ داری کے خلاف ہوگا۔ البتہ اب تک حروفِ مقطعات پر جتنی گفتگو کی گئی ہم نے یہ دیکھا کہ ان حروف کے تمام معجزانہ گوشوں کا اختتام آخرکار اسمائے اہل بیتؑ میں اسی خصوصیت کی تکرار پر ہوا۔ یعنی جو معجزہ ان حروف میں نظر آیا، وہی معجزہ اہل بیتؑ کے ناموں کے حروف میں بھی نظر آیا۔ اب اگر ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ حروفِ مقطعات قبولیت دعا کا روحانی اثر بھی رکھتے ہیں، تو کیوں نہ اس اثر کو اسمائے اہل بیتؑ میں دیکھیں۔ یہاں یہ باریک فرق پیش نظر رہے کہ اہل بیتؑ کی ذات تو ہمیشہ قبولیت دعا کا ذریعہ رہی ہے۔ ان ہستیوں کا واسطہ دے کر مانگی گئی دعا ہمیشہ بابِ اجابت تک پہنچتی ہے، اور یہ وہ حقیقت ہے جس پر ملت اسلامیہ کا ہر دور میں ایمان بھی رہا ہے اور عمل بھی۔ کوئی اہل بیتؑ کو اس طرح مانے جیسے فقۂ اہل بیتؑ کے پیرو مانتے ہیں یا اس حیثیت سے مانے کہ یہ ہستیاں محبوب خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبوب تھیں، ہر کوئی طلب دعا کے وقت ان کا حوالہ قبولیت دعا کی ضمانت سمجھتا ہے۔ چنانچہ ان کی ذات تو باب الحوائج ہے ہی، اس وقت تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ کیا ان کے لفظی اسماء بھی تاثیر قبولیت دعا رکھتے ہیں؟

میں اس مرحلے پر، خلافِ عادت، ایک ذاتی واقعہ بیان کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ واقعہ کیا ہے، یوں کہیے کہ دورِ حاضر کی ایک روایت ہے۔ اس روایت کی

تفصیلات اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ اس کے تمام راوی جانے پہچانے، معروف لوگ ہیں۔ اور سب اللہ کے فضل سے موجود بھی ہیں اور ان تک رسائی بھی ممکن ہے۔ چنانچہ صاحبانِ روایت سے تصدیق بھی ہو سکتی ہے۔

یہ ۱۹۸۰ء کی بات ہے، اردو زبان کے عہد ساز، صاحب طرز شاعر جناب افتخار عارف، ان دنوں لندن میں مقیم تھے۔ ایک دن اپنے حالات پر بات کرتے ہوئے انہوں نے ایک آپ بیتی سنائی کہ اپنے کراچی کے قیام کے دوران، ایک زمانے میں وہ بہت پریشانیوں میں گھر گئے۔ حالات ایسے تھے کہ ذہنی سکون رخصت ہو گیا۔ بے کلی اور اضطراب مستقل کیفیت ہو گئی۔ ایک دن پریشانی کے عالم میں ان کی ملاقات سرزمین بہار کے نامور صوفی خانوادے کے فرد، مولانا حسن مثنیٰ سے ہو گئی۔ افتخار عارف صاحب مولانا محترم سے عقیدت رکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی پریشانیوں کا ذکر مولانا سے کیا۔ جناب حسن مثنیٰ نے روداد سن کر افتخار عارف صاحب کو ایک درود تعلیم فرمایا، اور ہدایت کی کہ اس کا ورد کرتے رہا کرو۔ انشاء اللہ پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔ افتخار عارف صاحب نے عمل کیا اور چار پانچ دن میں انتہائی خوشگوار نتائج سامنے آنے لگے۔

جناب افتخار صاحب مسلک کے اعتبار سے حنفی العقیدہ ہیں۔ لیکن اہل بیت اطہارؑ سے حسن عقیدت کے ساتھ ساتھ ان کی وسیع المشربی نے انہیں بہت سی شیعی روایات اور طور طریقوں سے آگہی فراہم کر دی ہے......... وہ، مولانا کا عطا کردہ درود پہلے تو اپنے تفکرات اور پریشانیوں کے خاتمے کے لئے پڑھتے رہے، جب کچھ سکون ہوا اور درود کے الفاظ پر توجہ دینے کا موقعہ ملا، تو صاحب معلومات ہونے کے ناطے، چونکے۔ اور پانچ چھ دن بعد جب مولانا سے دوبارہ ملاقات ہوئی اور انہوں نے حال پوچھا تو یہ درود کے مؤثر ہونے کے اعتراف کے ساتھ، کہنے لگے: ''مولانا! آپ نے تو

مجھے شیعہ درود دے دیا۔'' اس پر مولانا نے جزبز ہو کر کہا، درود، درود ہوتا ہے یہ شیعہ سنی درود کیا مطلب؟ اس پر افتخار عارف صاحب نے توجہ دلائی کہ یوں تو اس درود میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف و فضائل کا ہی بیان ہے، لیکن ایک تو ان فضائل کی تعداد بارہ ہے، یہی کیا کم تھا، اس پر مستزاد یہ کہ آنجنابؐ کے بے پایاں اوصاف میں سے ان خاص بارہ فضائل کا انتخاب بھی دیکھیے، اور پھر ان کی ترتیب بھی ملاحظہ فرمائیں۔ اس پر مولانا نے بتایا کہ ہم شیعہ سنی تو نہیں جانتے البتہ یہ جانتے ہیں کہ یہ درود ہمارے بزرگانِ طریقت میں کئی نسلوں سے رائج بھی ہے اور مجرب بھی ہے۔

اب آپ بھی وہ درود ملاحظہ فرمائیں، لیکن اس سے پہلے یہ سن لیں کہ ۱۹۸۰ء سے اب تک ۱۸ سال (یہ گفتگو ۱۹۹۸ء میں کی گئی) ہو چکے ہیں، اس عرصہ میں، مَیں نے خود بھی اس درود کا ورد کیا اور بہتوں کو بتایا بھی، ہر مرتبہ فیض رساں ثابت ہوا۔ آپ کا دل چاہے آپ بھی ورد کیجیے، چاہیں تو تعقیباتِ نماز کے طور پر ہر نماز کے بعد پڑھیں، چاہیں سونے سے پہلے پڑھیں، سفر سے پہلے، سفر کے دوران، کسی بڑے کام کی ابتداء سے پہلے، دعا مانگنے سے پہلے، بطور منت کے، بطور تسبیح کے غرض جس طرح بھی چاہیں، اس کا ورد کریں، ہر حال میں باعث رحمت و فضل الٰہی ہے خصوصاً کسی پریشانی سے نجات کیلئے، ذہنی سکون کیلئے، اطمینانِ قلب کیلئے اسے مسلسل پڑھتے رہنا مجرب طور پر مفید ہے۔

اب ذرا یہ درود بھی پڑھ لیں:

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدِ نِ الَّذِی

اے اللہ درود بھیج ان محمدؐ پر جن کی صفات یہ ہیں کہ

عَلِیٌّ فِیْ دَرَجَاتِهٖ

وہ اپنے درجات میں بلند ہیں۔

وَ حَسَنٌ فِیْ صِفَاتِہٖ

اور صفات میں اچھے ہیں۔

وَ شَہِیْدٌ فِیْ تَجَلِّیَتِہٖ

اور اپنی تجلیات کے خود گواہ ہیں۔

وَ زَیْنُ الْعَابِدِیْنَ

اور عبادت کرنے والوں کی زینت ہیں۔

وَ بَاقِرِ عِلْمُ الْاَوَّلِیْنَ وَ الْاٰخِرِیْنَ

اور گزشتہ اور آئندہ کے علوم کو منکشف کرنے والے ہیں۔

وَ صَادِقٌ فِیْ اَقْوَالِہٖ

اور اپنے قول میں سچے ہیں۔

وَ کَاظِمٌ فِیْ جَمِیْعِ اَحْوَالِہٖ

اور اپنے تمام احوال کو منضبط کرنے والے ہیں۔

وَ مُتَمَکِّنٌ فِیْ مَقَامِ الرِّضَا

اور رضائے الٰہی کی منزل پر فائز ہیں۔

وَ جَوَّادُ الْکَفُّ عِنْدِ الْعَطَاء

اور بخشش کے وقت ان کا ہاتھ بہت سخی کا ہاتھ ہے۔

وَ ہَادِیٌ اِلٰی سَبِیْلِ النَّجَاۃ

اور نجات کا راستہ دکھانے والے ہیں۔

وَ عَسْکَرِیٌّ فِی الْغَزَاۃ

اور میدانِ جنگ میں ایک جنگجو سپاہی ہیں۔

وَ مَهْدِیٌّ اِلٰی طَرِیْقِ الْیَقِیْنَ

اور یقین کی راہ کی طرف ہدایت کرنے والے ہیں۔

وَ آلِهِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاهِرِیْنَ۔

اور درود بھیج ان کی پاک و پاکیزہ آل پر۔

آپ نے درود ملاحظہ فرمایا۔ اس درود میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف وفضائل کے لئے ہر جملہ ائمہ اثنا عشر علیہم السلام کے نام پر، ان کی ترتیب امامت کے مطابق، مشتمل ہے۔ ان تمام جملوں میں ان ہستیوں کی ذات کا بیان نہیں ہے۔ صرف ان کے اسمائے ذاتی یا صفاتی، اپنے لغوی معنوں میں، بیان ہوئے ہیں۔ اب اگر یہ درود غیر معمولی تاثیر رکھتا ہے، تو ایسا ہونا اس بات کی شہادت ہے کہ حروفِ مقطعات کی طرح اسمائے اہل بیت علیہم السلام، اپنی لفظی حیثیت میں بھی مؤثر ہیں۔

اور ضمناً اس حقیقت کی ایک اور شہادت بھی مل گئی کہ آلِ رسولؐ مرقع اوصافِ رسولؐ ہیں۔ اوصاف وکمالاتِ رسالتؐ کی شرح کرتے جایئے، خود بخود افرادِ اہل بیت علیہم السلام سے تعارف ہوتا جائے گا۔ یا آسان لفظوں میں یوں کہوں کہ خلق عظیم، جب ایک نقطے پر سمٹتا ہے تو ذاتِ رسالتؐ بنتا ہے اور جب پھیلتا ہے تو سلسلۂ امامتؑ بن جاتا ہے۔

ضمیمہ نمبر 1

حروفِ مقطعات اور ۱۹ کا عدد

خلیفہ رشاد نے اپنی تحقیقات کو ابتداء میں مختلف مضامین کی صورت میں شائع کیا۔ ان مضامین نے اور بہت سے افراد کو قرآن کی عددی تعبیر کی طرف متوجہ کیا۔ اس طرح اس حوالے سے کافی مواد جمع ہوگیا۔ بعدازاں خلیفہ رشاد نے 72 صفحات پر مشتمل ایک کتابچہ بعنوان ''قرآن کے ریاضیاتی معجزے'' Mathematical Mircale of Quran شائع کیا جس میں بڑی عرق ریزی سے قرآن مجید کے حروف، الفاظ، آیات اور سورتوں سے ۱۹ کے عدد کے ربط کو دریافت کیا گیا تھا۔ یہاں پر اختصار سے صرف حروفِ مقطعات کی تعداد کے ۱۹ کا حاصل ضرب ہونے کے بارے میں متعلقہ اعداد و شمار درج کیئے جا رہے ہیں۔

ق

۱۔ سورہ ق (۵۰) میں حرف ق ۵۷ مرتبہ آیا ہے۔ یعنی 57=3x19۔

۲۔ بیالسویں سورۃ الشوریٰ میں بھی حرفِ ق 57 مرتبہ آیا ہے یعنی 57=3x19۔

۳۔ حرف مقطع ق کی حامل دونوں سورتوں میں حرفِ ق 114 مرتبہ (57+57) مرتبہ آیا ہے۔ اور یہ عدد قرآن کی کل سورتوں کے مجموعہ کے برابر ہے۔

۴۔ قرآن حکیم میں لفظ قرآن 57 مرتبہ آیا ہے۔

۵۔ حرف مقطع ق کی حٰم دونوں سورتوں میں قرآن حکیم کو قرآن مجید کے نام سے پکارا گیا ہے۔ لفظ مجید کے حروف کا مجموعہ ابجد کے اعتبار سے (م=40)، (ج=3)، (ی=10)، (د=4) 57 بنتا ہے۔

۶۔ سورۃ الشوریٰ-42 کی کل آیات 53 ہیں یعنی 42+53=95 = 95=5x19

۷۔ سورۃ قٓ-50 کی کل آیات 45 ہیں۔ یعنی 50+45=95

۸۔ قرآن مجید کی تمام سورتوں میں جن سورتوں کی آیات کی تعداد 19 یا 19 سے زیادہ ہے، ان سورتوں کی آیت 19 میں مجموعی طور پر ق کا حرف 76 مرتبہ آیا ہے یعنی 76=4x19

ن

یہ حرفِ مقطع صرف ایک سورۃ القلم (68) میں آیا ہے۔ اس سورہ میں حرف ن مجموعی طور پر 133 بار آیا ہے یعنی 7x19

ترتیب قرآن میں سورہ والقلم وہ آخری سورہ ہے جس کا آغاز حرفِ مقطع سے ہوا ہے۔ اس طرح حروف مقطعات الم سے شروع ہونے والی پہلی سورہ سورۃ البقرہ (2) حرف مقطع والی آخری سورہ والقلم کی پہلی آیت تک، آیاتِ قرآنی کی کل تعداد 5263 ہے جو 19 کے عدد سے (277 مرتبہ) پورا پورا تقسیم ہو جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اور دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ سورہ بقرہ کے الم سے لے کر سورہ والقلم کے ن والقلم تک لفظ اللہ (2641 مرتبہ (139x19) اور حروفِ مقطعات سے باہر یعنی سورہ بقرہ (۲) سے پہلے اور سورہ والقلم (۶۸) کی پہلی آیت کے بعد 57 (3x19) مرتبہ یعنی مجموعی طور پر قرآن میں یہ لفظ 2698 مرتبہ (142x19) آیا

ہے۔

ص

سورۃ الاعراف 7-	میں حرف ص	97 مرتبہ آیا ہے۔
سورہ مریم 19-	میں حرف ص	26 مرتبہ آیا ہے
سورہ ص 38-	میں حرف ص	29 مرتبہ آیا ہے
میزان	29+26+97 =	8x19= 152

یٰسٓ

ی اور **س** پر مشتمل یہ دو حروفِ مقطعات اسی نام کی سورہ شمار 36 میں آئے ہیں۔اس سورہ میں **یا** کا حرف 237 مرتبہ، **سین** کا حرف 48 بار آیا ہے یعنی

15x19=285=48+237

حٰمٓ (ح، م)

نام وشمار سورہ	ح	م	مجموعہ حم
40-المومن	64	380	444
41- حم السجدہ	48	276	324
42-الشوریٰ	53	300	353
43-الزخرف	44	324	368
44-الدخان	16	150	166
45- الجاثیہ	31	200	231

46-الاحقاف	36	225	261
میزان	292	1855	2147
			113x19 =

عسق (ع س ق)

یہ سورۂ شوریٰ (42) میں حٰمٓ کے بعد دوسری آیت کے الفاظ ہیں۔اس سورہ میں ان حروف کی کیفیت یہ ہے کہ

ع=98، س=54، ق=57

جن کا میزان 209 ہے یعنی 11x19

الم (ا ل م)

نام سورہ	ا	ل	م	میزان
2-البقرہ	4502	3202	2195	521x19=9899
3-آل عمران	2521	1892	1249	298x19=5662
29-العنکبوت	774	554	344	88x19=1672
30-الروم	544	393	317	66x19=1254
31-لقمان	347	297	173	43x19=817
32-السجدہ	257	155	158	30x19=570
میزان	8945	6493	4436	1046x19=19874

sabeelesakina@gmail.com

الر (ا ل ر)

نام سورہ	ا	ل	ر	میزان
10-یونس	1319	913	257	131x19=2489
11-ھود	1370	794	395	131x19=2489
12-یوسف	1306	812	257	125x19=2375
14-ابراہیم	585	452	160	63x19=1197
15-الحجر	493	323	96	48x19=912
میزان	5073	3294	1095	498x19=9462

المر (ا ل م ر)

نام سورہ	ا	ل	م	ر	میزان
13-الرعد	605	480	260	137	78x19=1482

المص (ا ل م ص)

نام سورہ	ا	ل	م	ص	میزان
7-الاعراف	2529	1530	1164	97	280x19=5320

یہاں حرف **ص** کی یہ حیران کن حیثیت بھی پیش نظر رہے کہ یہاں اس حرف کی تعداد (97) **ال م** کے مجموعے سے مل کر اسے 19 سے قابل تقسیم بناتی ہے۔ تو دوسری طرف یہی **ص** سورۂ مریم 19 اور سورہ **ص** 38 کے حرف **ص** کے مجموعے سے مل کر ان سورتوں کے حاصل جمع کو 19 سے قابل تقسیم بناتا ہے۔

03333589401

كٓهٰيٰعٓصٓ (ك ہ ی ع ص)

یہ سب سے بڑا مجموعہ حروف مقطعات سورہ مریم 19 کا ابتدائیہ ہے اس سورہ میں ان حروف کا شمار درج ذیل ہے۔

ک =137 + ہ = 175 + ی = 343 + ع = 117 + ص = 26

کل مجموعہ = 42x19=798

ہ ، طٰہٰ، طٰسٓ ، طٰسٓمٓ (ہ ط س م)

ان حروفِ مقطعات میں ہ، ط، س، م کے چار حروف کی تکرار سورہ ہائے مریم 19، طٰہٰ-20، الشعراء-26، النمل-27 اور القصص-28 میں اس طرح ہوئی ہے کہ حرف ہ سورۂ مریم اور سورۂ طٰہٰ میں مشترک ہے، طٰہٰ کا ط باقی ماندہ چار سورتوں میں مشترک ہے۔ حرف س، الشعراء، النمل اور القصص میں اور حرف م سورۂ شعراء اور القصص میں مشترک طور پر موجود ہے۔ اس پیچیدہ ترکیب کا نتیجہ درج ذیل گوشوارے میں دیکھیے:

نام سورہ	ہ	ط	ص	م	میزان
19-مریم	175	_	_	_	
20-طٰہٰ	251	28	_	_	
26-الشعراء	_	33	94	484	
27-النمل	_	27	94	_	
28-القصص	_	19	102	460	
میزان	426	107	290	944	93x19=1767

ضمیمہ نمبر 2

خلیفہ رشاد، تحقیق سے گمراہی تک

خلیفہ رشاد، مصر کے ایک چھوٹے سے قصبے کُفر الزّیات کے ایک صوفی گھرانے کا فرد تھا۔ باپ ایک سلسلۂ تصوّف کے بانی تھے لیکن بیٹے کو ابتداء ہی سے جدید تعلیم کی راہ پر ڈالا۔ چنانچہ خلیفہ رشاد نے مصر کی عین الشمس یونیورسٹی کے زرعی کالج سے گریجویشن کی اور ۱۹۵۹ء میں امریکہ آ گیا۔ یہاں ایروزونا سٹیٹ یونیورسٹی سے بائیوکیمسٹری میں ماسٹر ڈگری اور کیلیفورنیا یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ اس کی زندگی کے تمام ملازمتیں بائیوکیمسٹری اور زراعت کے شعبہ سے ہی متعلق رہیں۔

اکثر مسلمان گھرانوں کی طرح، امریکہ کے قیام میں اسے اپنے دو بچوں کے لئے اسلامی تعلیم کی فکر ہوئی اور اس نے اپنے بچوں کو قرآن پڑھانا شروع کیا تو پہلے مرحلے پر ہی قرآن حکیم کے انگریزی ترجمہ کی ضرورت پڑی۔ اسے جو دو ترجمے دستیاب ہوئے (مارماڈیوک پکتھال۔ یوسف علی) وہ دونوں، بقول خلیفہ رشاد اہل زبان حضرات نے نہیں کیے تھے اس لئے ان میں غلطیاں تھیں (حالانکہ غلطیوں سے پاک ترجمہ کے لئے صرف عربی زبان کا مادری زبان ہونا کافی نہیں۔ پھر عربی زبان کا اہل ہوتے ہوئے اس زبان میں بھی اہلیت درکار ہے، جس میں ترجمہ ہو رہا ہے۔ اگر اہل زبان نہ ہونے کی وجہ سے کوئی مترجم قرآن کے حقیقی مفہوم کو نہیں سمجھ سکا تو جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا اس کا اہل زبان نہ ہونے سے مفہوم کو بیان کرنے میں غلطی ہو جائے گی۔ غرض کسی ترجمہ

کے غلط یا صحیح ہونے کے لئے اہل زبان کا پیمانہ کبھی بھی درست نتائج تک نہیں پہنچا سکتا)۔

اس مسئلہ کے ساتھ دوسری دشواری اس وقت پیش آئی جب زیرِ تعلیم بچوں نے اس سے حروفِ مقطعات کا مفہوم دریافت کیا۔ اس سوال کا اس کے پاس کوئی مناسب جواب نہیں تھا۔ اسلامی علوم کا جو محدود لٹریچر اسے دستیاب تھا وہ بھی اس سوال کو حل کرنے میں ناکافی ثابت ہوا۔ چنانچہ ڈاکٹر رشاد نے ان دونوں مسائل کے حل کی تلاش شروع کی۔

جہاں تک ترجمہ کا تعلق تھا تو اس سلسلہ میں اس نے اہل زبان عربی ہونے کی بنیاد پر فیصلہ کیا کہ وہ قرآن حکیم کا ترجمہ خود کرے گا۔ ہر چند اس کا ترجمہ، حروفِ مقطعات کے بارے میں اس کی تحقیقات کے کے بعد منظر عام پر آیا۔ لیکن ترجمہ ایک تو ''انگریزی زبان میں موجود بہترین ترجمہ'' ہونے کا مدعی تھا، دوسرے اس پر بطور عنوان، ایک اور دعویٰ درج تھا جو مترجم کے ذہن پر اس کے ماحول کے اثرات کا عکاس تھا، اس دعوے کے مطابق یہ قرآن حکیم کا ''اختیار یافتہ انگریزی نسخہ'' (Authorized English Version) تھا اور یہ اختیار کسی اور نے نہیں خود ''مصنف قرآن'' (Auther of the book) یعنی اللہ نے عطا کیا تھا۔ بہت سے لفظوں میں بیان کئے گئے ان دعوؤں کا مفہوم یہ تھا کہ قرآنِ حکیم اگر عربی کی بجائے انگریزی میں نازل ہوتا تو وہ لفظ بلفظ اس ترجمہ کے مطابق ہوتا۔

اس دعوے کی حقیقت کو جاننے کے لئے صرف ایک مثال کافی ہوگی۔ قرآن کے ترجمہ یا کسی غیر عربی زبان میں اسلام کے کسی اور موضوع پر قلم اٹھانے کے لئے بظاہر ضرورت نہیں تھی کہ دینِ اسلام کا ذکر کرتے ہوئے لفظ اسلام کا بھی ترجمہ کیا جائے۔ لیکن

ڈاکٹر رشاد نے اسلام کا نام اسلام کی بجائے انگریزی میں (Submission) رکھا۔ اور آج کمپیوٹر (Net) پر ان کے مسلک کی ترجمان سائٹ کا نام بھی Submission.org ہے جب کہ یہ ترجمہ اسلام کے معنی کے ایک جزو، تسلیم و رضا کا تو عکاس ہے لیکن اس میں امن و سلامتی کے کوئی معنی شامل نہیں ہیں۔

درحقیقت ڈاکٹر رشاد کا ترجمہ علم دین کی ناپختگی کی حالت میں مغرب کے شبہات اور اعتراضات کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کا مظاہرہ ہے۔ اس کی پہلی مثال تو اپنے ترجمہ کو Authorized Version قرار دینا ہے۔ اس لئے کہ یہ اصطلاح خالصتاً یورپی عیسائیت کی اصطلاح ہے جہاں بائبل کے ایک سے زیادہ نسخے ملتے ہیں۔ ان میں سے کچھ مصدقہ یا اختیار یافتہ ہیں جیسے:

Authorized King James Version

ان مصدقہ یا اختیار یافتہ نسخوں کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ بائبل (عہد نامہ قدیم و جدید) کے ایک سے زیادہ اور ایک دوسرے سے مختلف نسخے ہیں۔ ایسی صورت میں ضرورت ہے کہ ہر نسخہ اپنے صحیح ہونے کی گواہی لائے۔ اس لئے وہ کسی نہ کسی اتھارٹی سے منسوب ہے۔ لیکن قرآن حکیم کسی تصدیق کرنے والے کی تصدیق، اور کسی قصہ گو کی بیان کردہ تاریخ کا محتاج نہیں کہ وہ گواہی دے تو قرآن، قرآن ثابت ہو۔ وہ اپنے آغاز سے آج تک ایک ہی نسخہ تھا اور ہے، اسے کوئی خدا کا کلام مانے یا نہ مانے، لیکن یہ ضرور تسلیم کرے گا کہ قرآن کے نام سے ایک کتاب ہے جس کا متن لفظ بلفظ اور حرف بحرف طے شدہ ہے اور ایک ہے۔

رہ گیا انگریزی یا کسی غیر عربی زبان میں اس کا ترجمہ، تو آج تک کسی عالم سے عالم مترجم نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس کا ترجمہ حرفِ آخر ہے۔ اور اس سے زیادہ صحیح ترجمہ

ہو ہی نہیں سکتا۔ یا اس کا ترجمہ اللہ سے مصدقہ ہے۔ ہر ترجمہ کرنے والے نے ترجمہ کو اپنی طرف ہی نسبت دی ہے۔ اللہ کی طرف سے مصدقہ ترجمہ کہنے کا خیال سوائے خلیفہ رشاد کے، کسی بھی زبان میں ترجمہ کرنے والے مترجم کو نہیں آیا۔

ڈاکٹر رشاد کا یہ دعویٰ اس اعتبار سے بھی مضحکہ خیز ہے کہ گزشتہ چودہ سو سال میں قرآن مجید کے متعدد زبانوں میں ترجمے ہوئے، لیکن ان ترجموں کے کلام مخلوق ہونے، اور قرآن حکیم کے کلام الٰہی ہونے میں اس طرح بھی امتیاز رکھا گیا کہ یہ بات تمام ملت اسلامیہ نے متفقہ طور پر تسلیم کی کہ دنیا کا بہترین ترجمہ بھی قرآن کے عربی متن سے مسلمان کو بے نیاز نہیں کرتا۔ اور صرف ترجمہ پڑھ لینے سے، قاری کے اس عمل کو تلاوتِ قرآن ہرگز نہیں کہا جائے گا۔ چنانچہ دنیا کے تمام مسلمان الگ زبان رکھتے ہوئے اور عربی زبان سے ناواقف ہوتے ہوئے بھی مجبور تھے کہ قرآن پاک کی تلاوت اسی زبان میں کریں جس میں قرآن نازل ہوا ہے۔ اب اگر آج جب نزول قرآن کو کم وبیش ڈیڑھ ہزار سال گزر چکے ہیں تو اللہ نے ایک اور زبان (انگریزی) کو شرف بخشا کہ اپنے کلام کو انگریزی میں ڈھال کر رائج کر دیا۔ تو سوال یہ ہے کہ صرف انگریزی میں اللہ کی تصدیق سے مشرف ہونے والی تحریکیوں، دنیا کی اور لاتعداد زبانیں اس سے محروم کیوں رہیں۔ خصوصاً اہل ایران اور اہل برصغیر نے عربی زبان سیکھ کر قرآن کی اتنی خدمت کی کہ دنیائے عرب کی مجموعی علمی خدمات، اہل ایران اور اہل ہند کی انفرادی کوششوں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ اس صورت میں ضرورت تھی کہ انگریزی سے بہت پہلے فارسی اور اردو میں مصدقہ نسخہ فراہم ہوتا۔ اس طرح یہ خادمانِ قرآن بھی اہل زبانِ عربی نہ ہونے کی وجہ سے حقیقی تعلیمات قرآن سے بے بہرہ نہ رہ جاتے۔ بلکہ اپنی اپنی زبان میں مصدقہ نسخۂ قرآن سے اسی قدر فیض اٹھاتے جتنا کوئی عرب مستفید ہو سکتا ہے۔

خلیفہ رشاد کے ''اختیار یافتہ نسخہ قرآن'' میں اگر مغرب کے اثرات کو دیکھنا ہے تو خصوصیت سے ان مقامات کو دیکھیے جہاں تعلیماتِ اسلامی کا مغربی ثقافت یا موجودہ عہد کے مغربی اندازِ فکر سے خفیف سا بھی تصادم ہے۔ ایسے مواقع پر ڈاکٹر رشاد کا قلم قرآن حکیم کے تمام مروجہ ترجموں سے علی الاعلان لاتعلقی ظاہر کرتا ہوا مغرب کی ہمنوائی شروع کر دیتا ہے۔ خلیفہ رشاد کی نظر میں (بلکہ بقول خلیفہ، اللہ کی نظر میں) جہاں جہاں پرانے مترجمین ٹھوکر کھاتے رہے اور قرآن حکیم کی تعلیمات سے انحراف کرتے رہے ان میں سے نمایاں ترین مقامات یہ ہیں:

- زکوٰۃ کے مستحقین بتدریج والدین، اعزاء، یتامیٰ، مساکین اور مسافر ہیں۔ (شاید یہ بات صرف مغربی معاشرت میں ممکن ہے کہ بوڑھے والدین، صاحب استطاعت اولاد کی دی ہوئی خیرات و زکوٰۃ پر گزارہ کرتے ہوں)۔
- چالیس سال کی عمر کے بعد ہی کوئی شخص خدا کے متعلق اپنے عقیدے کا جوابدہ ہے۔
- حضرت عیسیٰ علیہ السلام وفات پا چکے ہیں۔ ان کی روح آسمان پر لے جائی گئی ہے۔
- حضرت عیسیٰ علیہ السلام کبھی دنیا میں واپس نہیں آئیں گے۔
- یہ کہنا غلط ہے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان پڑھ تھے۔ وہ تعلیم یافتہ تھے۔ اور قرآن حکیم انہوں نے دیگر کاتبوں کے ساتھ مل کر اپنے ہاتھ سے لکھا۔
- اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے کا حکم

نہیں دیا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے خواب کو (نعوذ باللہ) غلط سمجھے۔
البتہ اللہ نے باپ بیٹے کو شیطان کے منصوبہ سے بچالیا۔

- چور کی سزا ہاتھ کاٹ دینا نہیں بلکہ ہاتھ پر نشان لگانا ہے۔
- شادی شدہ افراد کے زنا کی سزا رجم (سنگسار کرنا نہیں) بلکہ سو علامتی کوڑے ہے۔
- قرآن موت کی سزا کے خلاف ہے۔

دریافت

لیکن یہ سب بعد کی بات ہے۔

ڈاکٹر خلیفہ رشاد کو اپنے دو بچوں کو قرآن پڑھاتے ہوئے، سورہ بقرہ کے ابتدائی الفاظ **ا ل م** پر ٹھہرنا پڑا۔ بچے ان حروف کا مطلب پوچھ رہے تھے اور ڈاکٹر رشاد کے پاس ان کا جواب نہیں تھا۔ ان الفاظ کے معنی کی تلاش میں وہ سرگرداں رہا۔ آخرکار اس نے طے کیا کہ ان الفاظ کو سمجھنے کے لئے وہ کمپیوٹر کی مدد لے گا۔ ابھی کمپیوٹر عام نہیں ہوئے تھے۔ اس نے اپنے ادارے کے کمپیوٹر کو مخصوص مدت کے لئے قیمتاً استعمال کرنے کی اجازت مانگی۔ اسے اجازت مل گئی۔ قیمت کی ادائیگی کے لئے اس کے احباب اور کچھ مسلمان تنظیموں نے مدد کی۔ چنانچہ پورا قرآن پہلی مرتبہ کمپیوٹر میں تحریر کرلیا گیا۔

ڈاکٹر رشاد ایک پہلے سے سوچے ہوئے مفروضہ پر کام کررہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ممکن ہے حروفِ مقطعات کوئی ریاضیاتی ربط رکھتے ہوں۔ یہ خیال اس وقت حقیقت کے بہت قریب نظر آیا جب اس نے دیکھا کہ **ق**، دو مقامات سورۂ **ق** اور سورۃ الشوریٰ میں بطور حرفِ مقطع نازل ہوا ہے۔ جب ان دونوں سورتوں میں مختلف الفاظ میں آئے

ہوئے حرف ق کا شمار کیا گیا تو یہ دلچسپ حقیقت سامنے آئی کہ دونوں سورتوں میں اس حرف کی تعداد ۵۷، ۵۷ ہے۔ کچھ یہی کیفیت دوسرے حروف مقطعات کے ساتھ تھی۔ پھر بسم اللہ الرحمن الرحیم کے حروف کی تعداد، قرآن حکیم میں کل بسم اللہ، کل سورتیں، غرض قرآن مجید کے متعلق جس حوالے سے بھی اعداد و شمار جمع کئے گئے تو ان سب میں ایک خاص کیفیت نظر آئی یعنی یہ کہ کم و بیش ان سب کا ایک جزوِ ضربی 19 ضرور تھا۔

قرآن حکیم میں معنویت، اس کی ظاہری صورت اور اس کے اثرات کے متعلق متعدد معجزانہ اور حیرت زدہ کر دینے والی صفات و خصوصیات اس سے پہلے بھی مسلمان علماء کے پیش نظر تھیں اور ان صفات کا ذکر اکثر ایمان افزاء ہوتا رہتا تھا۔ لیکن خلیفہ رشاد کی تحقیقات و انکشاف نے بیسویں صدی کی ساتویں اور آٹھویں دہائی میں قرآن شناسی کی ایک نئی لہر دوڑا دی۔ ایک طرف تو ان انکشافات کی دل کھول کر پذیرائی کی گئی۔ رسائل، اخبارات وغیرہ نے ان انکشافات کے خلاصے شائع کیے۔ اس عہد میں لکھی گئی تفاسیر میں علماء نے اس ریاضیاتی توازن کا حوالہ دیا۔ احمد دیدات جیسے امریکی نژاد مسلمان عالم نے عیسائی اور یہودی علماء سے مناظروں کے دوران ڈاکٹر رشاد کی دریافت کو اپنا اسلحہ بنایا۔ غرض دنیا بھر کے پڑھے لکھے مسلمانوں نے اپنی اپنی فہم اور دلچسپی کی حد تک خلیفہ رشاد سے واقف ہوتے ہوئے یا عدم واقفیت کے باوجود اس انکشاف سے دلچسپی کا اظہار کیا۔۔۔۔۔ ایک طرف اس ریاضیاتی انکشاف کو سر آنکھوں پر جگہ دی جا رہی تھی تو دوسری طرف ڈاکٹر خلیفہ رشاد کو بھی خوب عزت و احترام ملا۔ امریکہ کی متعدد اسلامی تنظیموں نے اسے اپنے اجتماعات میں اظہارِ خیال کی دعوت دی۔ ہر طرف سے مالی امداد اور وسائل کے چشمے جاری ہو گئے۔ مشرقِ وسطیٰ کی کچھ مسلمان حکومتوں نے ڈاکٹر موصوف کو مہمان بنایا۔ اس کو انعام و اکرام سے نوازا اور اس کی متعدد ضروریات کی فراہمی کی ذمہ

داری لی۔۔۔۔۔غرض مسلم معاشرے نے ہر وہ ذمہ داری نبھائی جو اسلام اور قرآن کے کسی خادم کے لئے مسلم معاشرے پر عائد ہوتی تھی۔

گمراہی

یہ دنیا دار الامتحان ہے۔ یہاں خداوند عالم کبھی بندوں کو لطف و کرم و عنایات کی بارش سے آزماتا ہے اور کبھی دی ہوئی نعمتوں کو واپس لے کر آزماتا ہے۔ بائیو کیمسٹری اور زراعت کے ایک ماہر کا قرآن حکیم جیسی کتاب کے متعلق ایک ریاضیاتی حقیقت سے آگاہ ہو جانا، خلیفہ رشاد پر اللہ کا خصوصی کرم تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ اس انکشاف کو عوامی مقبولیت اور پذیرائی بھی مل جائے۔ اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ سر تسلیم، شکر گزاری میں خم ہو جاتا اور اللہ سے مزید نعمتوں کی درخواست ہوتی، ڈاکٹر رشاد نے بھکنا شروع کیا۔ اس نے سب سے پہلے یہ سمجھ لیا کہ چونکہ عربی اس کی مادری زبان ہے اور اس نے قرآن حکیم کے متعلق ایک عددی حسن و توازن دریافت کیا ہے اس لئے وہ بہت بڑا عالم قرآن ہے۔ حالانکہ وہ مصری نژاد ہوتے ہوئے حجاز کی قرآنی عربی میں خود کو اہل زبان ہونے کا اہل ثابت کر سکے یا نہیں یہ بات تو واضح تھی کہ اس کا انکشاف کہ "قرآن 19 کے عدد سے ترتیب دیا گیا ایک حیران کن حسابی معجزہ ہے"، قرآن حکیم کے اصل پیغام سے کوئی ربط نہیں رکھتا تھا اور نہ ہی اس انکشاف نے قرآن فہمی میں کوئی مدد مل سکتی تھی۔ ہم ڈاکٹر رشاد کے انکشاف کو قرآن کے ایک بالائے عقل انسانی تخلیق کے ثبوت میں تو پیش کر سکتے تھے لیکن اس سے ہدایت انسان کا کوئی سبق حاصل نہیں کر سکتے تھے۔

ان تمام حقائق سے چشم پوشی کرتے ہوئے خلیفہ رشاد خود کو بہت بڑا عالم قرآن سمجھنے گا۔ اور اس زعم میں اس نے جب کتاب الٰہی کا انگریزی ترجمہ کیا تو اسے اپنا کیا ہوا

ترجمہ کہنے کی بجائے اللہ کی طرف سے سند یافتہ انگریزی قرآن کہنے لگا۔

معاملہ مزید بگڑا تو اس نے حدیث اور سنت سے اخذ احکام اور اس کی حجیّت سے انکار کر دیا۔ اس کے کہنے کے مطابق بعد رسولؐ مسلمانوں نے اقوالِ رسولؐ اور احکامِ اسلامی کو اس طرح مسخ کر دیا کہ اب کلمہ شہادت، وضو، صلاۃ، زکوٰۃ، روزہ اور حج سب اپنی صحیح شکل گم کر چکے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق صرف ایک واحد درست حدیث ہے اور وہ بھی قولِ الٰہی ہے جو سورہ (۲۵) کی تیسویں آیت میں ہے کہ:

''رسولؐ قیامت کے دن شکایت کریں گے کہ اس کی امت نے قرآن کو مہجور (ہجر زدہ تنہا) کر دیا۔''

اس آیت کی تاویل ان الفاظ میں کی گئی کہ:

''رسولؐ قرآن کے چھوڑے جانے کی شکایت کریں گے، یہ شکوہ نہیں کریں گے کہ امت نے حدیث اور سنت کو چھوڑ دیا۔''

غرض اس نے حدیث رسولؐ کی شرعی حیثیت سے قطعاً انکار کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ حدیث صرف اللہ کی ہوتی ہے اور اللہ نے صرف اپنی حدیث کو جائز (Legitimate) حدیث قرار دیا ہے (غالباً یہ احسن الحدیث کا ترجمہ کیا گیا ہے)۔

بات مزید آگے بڑھی تو اپنی بعض دشواریوں کی وجہ سے اس نے قرآن حکیم کو تحریف شدہ قرار دے دیا اور دعویٰ کیا کہ سورۂ توبہ کی آخری دو آیات (۱۲۸، ۱۲۹) قرآن میں بڑھا دی گئی ہیں۔ (اس سلسلہ میں ڈاکٹر رشاد کے موقف کا مختصر تجزیہ آئندہ سطور میں بیان ہوگا)۔

بے راہ روفکر کی انتہائی پستی اس وقت آئی جب خلیفہ رشاد نے یہ کہنا شروع کیا کہ اس کی ریاضیاتی دریافت ایک غیر معمولی معجزہ ہے۔ جو آغازِ نزول قرآن (ہجرت

سے 13 سال پہلے) سے پورے 1406 سال بعد (1393 ہجری میں) ظاہر ہوا ہے اور یہ مدت بھی 19 سے پوری پوری تقسیم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس قدر عظیم الشان معجزہ کسی عام عالم کے ذریعہ ظاہر نہیں ہوسکتا۔۔۔۔۔ الغرض خلیفہ رشاد نے دعویٰ کیا کہ وہ نبی (Prophet) تو نہیں ہے البتہ اللہ کا بھیجا رسول (Messenger) ہے۔ اس کے نزدیک مسلمان علماء نبی اور رسول کی جو تعریف کرتے رہے ہیں وہ قرآنی احکامات کے برعکس ہے۔ نبوت تو جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ختم ہوگئی ہے لیکن رسالت آج بھی جاری و ساری ہے۔ب۔۔۔ قرآن اور حدیث کے متعلق خلیفہ رشاد کے بے حقیقت الزامات پہلے ہی اس کی شخصیت کو مشکوک بنا چکے تھے۔ اس کے دعوائے رسالت نے اس کے رہے سہے احترام کو بھی خاک میں ملا دیا۔ ملت اسلامیہ نے جس طرح اس کی دریافت کے سلسلہ میں اسے سر آنکھوں پر بٹھایا تھا اسی طرح اس کے دعوائے تعریف قرآن، انکارِ حدیث اور آخرکار رسالت کے دعوے نے اسے مسلمانوں کی نظروں سے گرا دیا۔ وہ مسلمان معاشرے سے کٹ کر امریکہ میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہا تھا کہ جنوری 1990ء میں اسے نامعلوم قاتل نے قتل کر دیا۔ خلیفہ رشاد کے پیروکاروں کا دعویٰ ہے کہ اسے امریکہ کے سیاہ فام مسلمانوں کے ایک گروہ نے قتل کیا جو فقراء کہلاتا تھا۔ اس دعوے کا تازہ جزو یہ ہے کہ ''سیاہ فام مسلمانوں کے فقراء نامی اس گروہ کو جو ایک بین الاقوامی دہشت گرد تنظیم تھی، پاکستان اور سعودی عرب سے متحرک کیا جاتا ہے'' اور ایف بی آئی نے بعد ازاں دریافت کیا کہ ''فقراء کا یہ گروہ اس گروہ سے بھی منسلک ہے جنہوں نے 11 ستمبر 2001ء کو نیویارک کا ورلڈ ٹریڈ سینٹر تباہ کیا تھا۔ ان کا تعلق القاعدہ اور اسامہ بن لادن سے بھی ہے۔''

(نوٹ:۔ مندرجہ بالا دعویٰ اور مضمون کی دیگر معلومات خلیفہ رشاد کی ترجمان

سائٹ Submission.org پر موجود درج ذیل کتابوں سے لی گئی ہیں:

1. Dr. Rashad Khalifa, The Man, The Issues and the Truth.
2. Mathmatical Miracle of the Quran by Khalifa Rashad.
3. Authorized English Version of the Quran by Khalifa Rashad.

خلیفہ رشاد کے بعد

خلیفہ رشاد نے اپنے نعرے ''قرآن اور صرف قرآن'' پر چند لوگوں کو اپنا ہم خیال بنالیا تھا۔ ان لوگوں نے خود کو United Submitters International کے نام سے منظم کیا ہے۔ اس گروہ کے افراد خود کو عربی لفظ مسلم یا مسلمان کی بجائے اس لفظ کے نیم متبادل انگریزی لفظ سمٹر Submitter کے نام سے متعارف کراتے ہیں۔ ان لوگوں کا مرکز امریکہ کی ریاست ایروزونا کے شہر ٹکسن میں واقع ایک مسجد ہے جسے خلیفہ رشاد نے قائم کیا تھا۔ اس مقام سے تنظیم کی طرف سے ڈاکٹر رشاد کا ترجمہ قرآن اور دیگر کتب شائع کرکے اب (2008ء میں) بھی امریکہ کی مسلم آبادی میں تقسیم کی جاتی ہیں۔ تنظیم کی نشر و اشاعت کا سب سے بڑا ذریعہ انٹرنیٹ ہے۔ جس پر Submission.org کے نام سے وہ اپنی انتہائی محدود کتب و رسائل کو پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انٹرنیٹ ہی کی ایک انسائیکلوپیڈیا کے مطابق اس گروہ کے سب سے زیادہ افراد ہندوستان کے شہر ممبئی میں پائے جاتے ہیں۔

1990ء میں خلیفہ رشاد کے مارے جانے کے بعد اس کے پیروکاروں میں ایک ترکی نژاد امریکی مصنف ادیب یکسل (Edip Yuksel) اور اس کے ساتھ ڈاکٹر رشاد کے زیر اثر آنے والے چند ابتدائی سمٹرز، اپنے گروہ کی اکثریت سے یہ کہہ کر الگ ہو گئے کہ سمٹرز اللہ کی بجائے خلیفہ رشاد ہی کے زیادہ وفادار ہو گئے ہیں، اور ایسی وفاداری ''شرک'' ہے۔

خلیفہ رشاد کے کام پر ایک نظر

اسلام کی تاریخ کے بالکل ابتدائی عہد سے ہمیں کچھ لوگوں کی یہ کوشش نظر آتی ہے کہ کسی طرح اسلام کو پیغمبر اسلام جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات، ان کے اقوال اور ان کے افعال سے الگ کر کے صرف اور صرف قرآن تک محدود کر دیا جائے۔ پھر ایسے لوگ بھی گاہے گاہے نظر آتے رہے جو دوسرے مذاہب یا دوسری تہذیبوں سے اس قدر متاثر تھے یا اسلام سے بے خبر یا اپنی کم علمی کی وجہ سے ایک طرح کے احساسِ کمتری کا شکار ہوتے ہوئے، چاہتے رہے کہ اسلام کی تعبیر دوسری تہذیبوں، معاشرتوں، نظریات، مذاہب کے مطابق ہو جائے۔۔۔۔ پھر مسلم تاریخ میں نبوت، رسالت اور مہدویت کے مدعی بھی پیدا ہوتے رہے۔۔۔۔ ان تمام آوازوں کا جواب ہر عہد میں علمائے اسلام نے دیا اور ایسی کوئی بھی تحریک مسلم معاشرے پر کوئی گہرا اثر نہ چھوڑ سکی۔ چنانچہ خلیفہ رشاد کا دعوائے رسالت، نعرۂ انکارِ سنت یا اسلام کو رائج الوقت امریکی معاشرت کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش وہ مسائل ہیں جن کو بارہا پرکھا جا چکا ہے اور ہر عہد کے علمائے اسلام ان انحرافی دعووں کا کھوکھلا پن نمایاں کرتے رہے ہیں البتہ خلیفہ رشاد نے دو باتیں نسبتاً نئی کہی ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں باتوں

پر ایک نظر ضرور ڈالی جائے۔ ان میں سے ایک قرآن کے عددی معجزے کا انکشاف ہے اور دوسرے یہ دعویٰ ہے کہ قرآن مجید میں تحریف ہوئی ہے اور سورۂ توبہ میں دو آیتیں اضافہ کی گئی ہیں۔

خلیفہ رشاد کی عددی دریافت

ڈاکٹر خلیفہ رشاد کی بعد میں کہی جانے والی کسی بے بنیاد اور غیر حقیقی باتوں اور دعوؤں سے قطع نظر اس کی وہ محنت جو اس نے حروفِ مقطعات اور ان کی سورتوں میں عددی ربط تلاش کرنے میں کی، وہ یقیناً لائق ستائش ہے۔ اس کی یہ دریافت کہ تمام حروفِ مقطعات جتنی مرتبہ اپنی سورتوں میں آئے ہیں ان کا مجموعہ ہر جگہ 19 سے پورا پورا تقسیم ہو جاتا ہے، ایک دلچسپ، قابل توجہ اور بہت حد تک ایمان کو تقویت پہنچانے والی دریافت تھی اور یقیناً دنیائے اسلام نے اس کی محنت کو تسلیم بھی کیا اور ڈاکٹر رشاد کو اس کے کام کے عوض پوری طرح نوازا بھی۔ یہ دریافت قرآن حکیم کی عظمت کی گواہ بھی تھی اور قرآن کے من جانب اللہ ہونے کی شہادت بھی۔ چنانچہ اعداد و شمار کے تحت سامنے والے حقائق قرآن کے ایک اعجازی پہلو کا اظہار تو یقیناً ہیں۔ لیکن ڈاکٹر رشاد کی تحقیقات کسی طرح بھی تحقیقات کرنے والے کا معجزہ قرار نہیں پاتیں اور نہ ان میں ایسی کوئی بات ہے کہ محقق پر نبی یا رسول ہونے کا گمان ہونے لگے۔

اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ ہے کہ کسی غیر معمولی کیفیت کی ایجاد یا اس کا اہل دنیا کے سامنے مظاہرہ اپنے طور پر تو معجزہ ہو سکتا ہے لیکن کسی رازِ سربستہ کی محض دریافت کو معجزہ نہیں کہا جا سکتا۔۔۔۔۔ اگر دریافت معجزہ ہو تو انسان کی تاریخ میں فطرت کے کتنے ایسے رازہائے سربستہ تھے جنہیں دریافت کر کے انسان نے وہ کارنامے سرانجام دیئے

جن کی دریافت نے انسان کے طرز زندگی کو یکسر تبدیل کر دیا۔ فضاؤں میں اڑتے ہوئے جہاز، دور بیٹھے انسان سے رابطے، بجلی اور مادی ذرے میں چھپی ہوئی طاقتیں، سب فطرت کے قوانین پوشیدہ کو دریافت کرنے کا نتیجہ ہیں۔ تو کیا یہ دریافتیں کرنے والے بھی خود کو نبی یا رسول کہنا شروع کر دیں؟

اور پھر معجزہ کا امکان وہاں ہوتا ہے جہاں نتیجہ عمل اپنے ظاہرہ منطقی اسباب نہ رکھتا ہو۔ ایک مریض کو مختلف دوائیں دے کر، آپریشن کے ذریعہ، مصنوعی تنفس کی مدد سے زندگی دی جا سکے تو ایسے مریض کی صحت یابی کو کوئی شخص معجزہ نہیں کہے گا۔ لیکن اگر کبھی کسی کے قم باذنی کہنے سے مردہ زندہ ہو جائے تو اسے ضرور معجزہ کہا جائے گا۔ خلیفہ رشاد نے تین سال کی مسلسل محنت کے بعد کمپیوٹر کی مدد سے ایک ریاضیاتی حقیقت دریافت کر لی تو ہم اس کو ایک بڑی یا اہم یا غیر معمولی دریافت تو کہہ سکتے ہیں اسے انسان تلاش اور انسانی عقل وفہم کا ایک کارنامہ تو کہہ سکتے ہیں معجزہ نہیں کہہ سکتے۔

ڈاکٹر رشاد کی دریافت جب تک حروف مقطعات سے 19 کے عدد کے ربط تک تھی تب تک ایک چونکا دینے والا انکشاف تھا۔ لیکن اس نے اپنی دریافت سے ضرورت سے زیادہ توقعات وابستہ کر کے اسے پورے قرآن پر منطبق کرنا چاہا۔ آیات کی تعداد سورتوں کے نمبر شمار، حروف کی تعداد، حروف کی ابجدی قیمتیں، مختلف الفاظ کی تعداد، غرض مختلف انداز سے جمع تفریق کر کے یہ ثابت کرنا چاہا کہ 19 اور بس 19 ہی وہ واحد عدد ہے جو پورے قرآن حکیم کا مرکز ومحور ہے۔ اپنی اس کوشش میں اس نے کئی غیر ذمہ دارانہ اعداد وشمار بھی اپنی تحقیق کے نتائج میں شامل کر لیئے۔ کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں:

- قرآن مجید کی 96 ویں سورۃ العلق میں 304 عربی حروف ہیں (304=16x19)۔

- قرآن حکیم کی 29 سورتوں میں حروفِ مقطعات آئے ہیں۔ ان تمام سورتوں کا نمبر شمار باہم جمع کیا جائے (یعنی بقرہ 2 + آل عمران 3 + 7 + ---- 50 + 68 = 822، اس میں (حروفِ مقطعات کے 14 مجموعوں کو سامنے رکھتے ہوئے) 14 جمع کریں تو حاصل جمع 836 ہوگا۔ اور 836، 19 سے 44 مرتبہ تقسیم ہو جاتا ہے۔

پہلی حرف مقطع والی سورۃ البقرہ 2 میں اور آخری (حروف مقطع والی) سورۃ القلم 68 میں، درمیان میں حروف مقطعات کے بغیر 38 سورتیں آتی ہیں اور 38=2x19۔

- حروفِ مقطعات والی ہر سورہ میں مقطعات حروف جہاں جہاں آئے ہیں ان کا شمار کیا جائے۔ پھر ان سب کی ابجدی قیمت جمع کی جائے۔ مثلاً سورہ بقرہ 2 میں ال م کے حروف مجموعی طور پر 9899 مرتبہ آئے ہیں اور حروفِ ابجد کے اعتبار سے ان کی قیمت 188362 بنتی ہے۔ پھر سورہ آل عمران 3 میں پھر ال م ہے تو اس سورہ میں ال م کے حروف 5662 مرتبہ استعمال ہوئے ہیں ان کی ابجدی قیمت 109241 ہوتی ہے۔ اس طرح 29 حروفِ مقطعات والی سورتوں میں ہر سورہ کے مختلف الفاظ میں ان حروف کا مجموعی استعمال 41388 مرتبہ ہوا ہے اور حروفِ ابجد کے حساب سے ان سب کی قیمت 1048091 ہوتی ہے۔ ان دونوں اعداد کا مجموعہ 1089479 بنتا ہے جو 57341x19 کے برابر ہے۔

یہ چند مثالیں ہیں جو کسی انتخاب کے بغیر درج کر دی گئیں۔ اگر جمع تفریق کا یہ حسابی کھیل اسی طرح بغیر کسی قانون یا طے شدہ اصول کے کھیلا جائے تو ایک 19 کا عدد

کیا، کسی بھی عدد کو بطور نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ کمپیوٹر سے عملی دلچسپی رکھنے والا کوئی بھی شخص اس بات کی تائید کرے گا کہ اگر کمپیوٹر میں قرآن مجید کے حرف حرف کو درج کر دیا جائے، تو ایک اچھے پروگرام کے ذریعہ چند سیکنڈ میں معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اس میں کون کون سے مجموعۂ اعداد 11 سے، یا 17 سے، 19 سے، یا 23 سے پورے پورے تقسیم ہو سکتے ہیں اور اس طرح کسی بھی عدد کے حاصل ضرب اعداد کو ایک جگہ درج کر کے کسی بھی عدد کو قرآن مجید کا مرکزی عدد قرار دیا جا سکتا ہے۔

تحقیق یا حسابی بازیگری؟

خلیفہ رشاد نے اپنی کتاب ''قرآن کے حسابی معجزے'' میں جن باتوں کو معجزہ کے طور پر بیان کیا ہے ان میں سے ایک بڑی تعداد کا معجزہ ہونا تو درکنار، انہیں دیانتدارانہ سائنسی تحقیق کا درجہ بھی نہیں دیا جا سکتا۔ تحقیق کا مسلّمہ طریق کار یہ ہے کہ پہلے چند حقائق کی بنیاد پر محقق ایک مفروضہ قائم کرتا ہے اور پھر تمام معلوم کیفیات و حقائق کو اپنے قائم کردہ مفروضہ کے ذریعہ سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر اس کا مفروضہ تمام زیر بحث حقائق کی بلا استثناء تعبیر و تشریح کر دے تو مفروضہ کو بطور نظریہ تسلیم کر لیا جاتا ہے ورنہ محقق یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس کے مفروضے میں کہیں کوئی خامی ہے۔ اس خامی کو دور کرنے تک تحقیق نتیجہ خیز نہیں سمجھی جاتی۔

سائنس میں ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کرنے والے ایک محقق سے ہم اس متعصّبانہ روش کی امید نہیں رکھتے کہ وہ اپنے مفروضے کو درست ثابت کرنے کے لئے حقائق کو بدلنے میں دریغ محسوس نہیں کرے گا۔ ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ خود کو اپنی دریافت کے بل بوتے پر خدا کا فرستادہ کہلوانے والا، اپنے مفروضے کو اس قدر اٹل اور

حتمی سمجھتا ہے کہ کسی بھی غیر تائیدی صورتِ حال میں مفروضے پر نظر ثانی کرنے کی بجائے حقائق کو مسخ کرنا شروع کر دیتا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے نمایاں مثال حرف مقطع **ن** کی ہے۔ یہ حرف صرف سورہ والقلم 68 میں آیا ہے۔ سورہ والقلم میں حرف نون 132 مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ اب ڈاکٹر رشاد کے مفروضہ کے مطابق اس عدد کو بھی 19 سے پورا پورا تقسیم ہونا چاہیے تھا۔ لیکن اس نتیجہ تک پہنچنے میں ایک عدد کی کمی تھی اب اصولِ تحقیق تو یہ کہتا ہے کہ یہاں مفروضہ کو کلیہ نہ سمجھا جائے اور اس پر نظر ثانی کی جائے لیکن ڈاکٹر رشاد نے وہاں یوں تاویل کی:

> ''اس حرف کا تلفظ اصلی نسخہ (یعنی عربی) کے مطابق تین حروف **ن و ن** سے ادا ہوتا ہے۔ چنانچہ یہاں (سورہ والقلم میں) یہ حرف دو مرتبہ شمار کیا جائے گا۔ اس طرح سورہ میں **ن** کی تعداد 133 ہوگی اور 19x7=133''۔

چلیئے اگر اس بات کو بطور اصول مان لیا جائے کہ جہاں کسی حرف مقطع کے تلفظ میں ایک اور حرف مقطع آ جائے گا تو تلفظ کے تحت ادا ہونے والا زائد حرف بھی شمار ہوگا۔ تو جہاں جہاں (16 سورتوں میں) حرف میم بطور حرف مقطع آیا ہے وہاں اس کا شمار دو مرتبہ ہونا چاہیئے۔ یعنی مجموعۂ میم میں 16 کا اضافہ ہو جائے گا اور وہ مجموعہ کو 19 سے پورا پورا تقسیم نہ ہونے دے گا۔ اور مزید برآں ال م اور المر کے حروفِ مقطعات میں جب لام کا تلفظ کیا جائے گا تو ان میں بھی میم شامل ہوگا۔ اس طرح ال م کی چھ سورتوں اور المرٓ کی ایک سورۃ کے لام کا میم بھی مجموعہ میں شامل کرنا پڑے گا۔ اس طرح 7 میم + 16 میم =23 کا اضافہ ہو جائے گا جو 19 سے تقسیم کیئے جانے کے سارے منصوبہ کو خاک
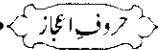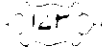
میں ملا دے گا۔

خلیفہ رشاد کے نزدیک قرآن مجید رسول اللہ ﷺ کے بعد عہد خلفاء میں جمع کیا گیا۔ اور اس جمع آوری کے دوران سورۂ توبہ 9 میں آخری دو جملوں کا اضافہ کر دیا گیا۔ (اس حوالے سے گفتگو آگے آئے گی)۔ اس الزام پر بحث سے پہلے یہ سمجھنا غلط نہ ہوگا کہ قرآن مجید کی موجودہ ترتیب کو خلیفہ رشاد عہد خلفاء کی بات قرار دیتے ہیں۔ اب اگر یہ ترتیب عہد خلافت کی ہے تو اس ترتیب کو ہرگز ہرگز معجز نما نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن خلیفہ رشاد کے نصف سے زیادہ گوشوارے سورہ کے نمبر شمار پر مبنی ہیں۔ مثلاً:

۱۔ سورہ 42 میں 53 آیات ہیں چنانچہ 42+53 = 95 =5x19۔
سورہ 50 میں 45 آیات ہیں چنانچہ 50+45 = 95 =5x19

۲۔ ایک تفصیلی چارٹ کے مطابق قرآن مجید کی حروف مقطعات والی سوروں کے نمبر شمار (بقرہ-2، آل عمران-3، الاعراف-7 ...... تا والقلم-68) کے نمبر ہائے شمار کا مجموعہ (2+3+7 ...... تا 68) 822 بنتا ہے۔ ان سوروں کی کل آیات کا مجموعہ 2743 ہے۔ ان میں حروف مقطعات والی آیات 30 ہیں، ان حروفِ مقطعات کی ابجدی قیمت 3435 ہے۔ اس طرح ان سب کا مجموعہ (نمبر ہائے شمار 822 + کل آیات 2743 + حروفِ مقطعات کی آیات + حروفِ مقطعات کی ابجدی قیمت =3435 30=7030=19x70)۔

اگر (بقول ڈاکٹر رشاد) انسان کی دی ہوئی ترتیب، اور ہر سورہ کا غیر الہامی نمبر شمار بھی 19 سے قابل تقسیم ہونے کا معجزہ دکھا سکتا ہے تو پھر کلام الٰہی میں معجزہ کیا ہوا اور خالق و مخلوق کا امتیاز کیا رہا؟

خلیفہ رشاد کی غیر محققانہ اور غیر اصولی فکر کا ایک مظاہرہ اور دیکھ لیں۔

اپنی کتاب Mathmaticle Miracle of Quran میں ایک عنوان Some Simple Facts میں لکھتے ہیں:

''قرآن مجید کی کل آیات 6346 ہیں یا 334x19 (6346 اس طرح کہ 6234 آیات تو نمبر شمار رکھتی ہیں اور 112 آیات بسم اللہ پر نمبر شمار نہیں ہیں۔ ان کا مجموعہ 6346 ہے)۔''

اس حوالے سے آیات کی جو کل تعداد 6234 بتائی گئی ہے وہ خود متنازعہ ہے۔ ایک تو تعداد آیت مفسرین میں متفقہ نہیں ہے۔ دوسرے ڈاکٹر رشاد نے دو آیتوں کو خارج از قرآن قرار دیا ہے۔ لیکن اس عدد پر کوئی بحث کئے بغیر ہم بات کو آگے بڑھائیں گے کہ خلیفہ رشاد نے جو 112 آیات بسم اللہ کو بغیر شمار کہا ہے اس کی صورت یہ ہے کہ ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے فرمان کے مطابق علاوہ سورۂ توبہ کے باقی 113 سورتوں میں موجود بسم اللہ (بسملہ) جزو سورہ ہے۔ جب کہ مفسرین اہل سنت کے مطابق صرف سورہ حمد میں (اور بعض کے نزدیک وہاں بھی نہیں) جزو سورہ ہے اور باقی سورتوں میں اس کا اندراج تبرکاً کیا جاتا ہے۔ چنانچہ 112 مرتبہ وہ جزو قرآن نہیں ہے۔ اس لئے کسی سورہ میں تعداد آیت کا حساب کرتے ہوئے بسملہ کو شمار نہیں کیا جاتا (یہاں ضمناً یہ عرض کر دیا جائے کہ اگر بسم اللہ تبرکاً لکھا جاتا ہے تو سورۂ توبہ کو اس سے کیوں محروم رکھا گیا۔ اور اگر یہ استثنیٰ حکم خدا و رسولؐ سے ہے تو باقی سورتوں پر بسملہ کی موجودگی بھی حکم خدا و رسولؐ سے ہوگی۔ اور جب اللہ اور اس کا رسولؐ بسملہ کو سورہ کے ساتھ رکھ رہے ہوں تو ہم کون ہے کہ اسے قرآن سے خارج کر دیں؟)۔۔۔۔۔

خلیفہ رشاد نے اپنے مندرجہ بالا حساب میں 112 سورتوں میں آنے والی

بسملہ کو شمار کیا ہے تو گویا انہوں نے عام اہل سنت سے اختلاف کرتے ہوئے ان تمام بسم اللہ کو جزو قرآن قرار دیا ہے۔۔۔۔۔ اب ایک اور صورت حال ملاحظہ ہو۔ ڈاکٹر رشاد نے لفظ اللہ پر ایک الگ نوٹ تحریر کیا ہے۔ اس میں آغاز گفتگو اس انکشاف سے ہوتا ہے کہ اللہ کا لفظ قرآن مجید میں 2698 مرتبہ آیا ہے (یعنی 142x19)۔۔۔۔۔ خلیفہ رشاد سے بہت پہلے مصر کے نامور عالم استاد محمد فواد عبد الباقی نے قرآن حکیم کے الفاظ کا ایک انتہائی جامع انڈیکس **اَلْمُعجَمُ المُفهَرس** کے نام سے ترتیب دیا۔ یہ معجم قرآن پر کام کرنے والے مبتدی سے لے کر عالم تک ہر ایک کی ضرورت ہے۔ غرض فواد عبد الباقی نے اللہ کا شمار تین عنوان سے کیا ہے۔ اَللّٰہُ (980)، اَللّٰہَ (592) اور اَللّٰہِ (1125)۔ ان تینوں رقوم کا حاصل جمع 2697 ہے۔ ہمارے پاس بظاہر کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ جس سے ہم یقینی طور پر یہ جان سکیں کہ خلیفہ رشاد کا مجموعہ ایک عدد زیادہ کیوں ہے۔ لیکن فواد عبد الباقی نے ان تمام آیات کا حوالہ بھی دیا ہے جن سے یہ اعداد حاصل ہوئے۔ چنانچہ ان آیات کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے صرف اس بسملہ کو جزو قرآن سمجھا ہے جو سورہ نمل 27 میں دورانِ سورہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے خط کی پیشانی پر درج تھا۔ (نشان آیت-30)۔ اس کے مقابلے میں خلیفہ رشاد نے سورہ الحمد کے بسملہ کو جزو قرآن سمجھتے ہوئے اللہ کے لفظ کو ایک بار زیادہ شمار کیا ہے۔۔۔۔۔ لیکن سوال ہے کہ صرف ایک بار کیوں؟ اس سے پہلے آیاتِ قرآنی کی تعداد کو 19 سے قابل تقسیم بنانے کے لئے سورہ الحمد اور سورہ نمل کے علاوہ باقی ماندہ 112 بسملہ کو شامل حساب کر لیا گیا۔ اور جب اللہ کے لفظ کی باری آئی تو صرف سورۃ الحمد و سورۃ النمل کے بسملہ کو شامل کیا گیا۔ اور باقی 112 کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا۔۔۔۔۔ اپنے مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کے لئے اس طرح حقائق کو حسب ضرورت مسخ کرتے رہنا اور بار بار موقف کو

تبدیل کرتے رہنا کسی محقق کے لئے درکنار، عام سطح کی علمی شخصیت کے لئے بھی قابل قبول نہیں ہوگا۔

قرآن میں تحریف کا الزام

قرآن مجید ایک زندہ معجزہ ہے۔ لیکن اس معجزہ کا انحصار اس بات پر نہیں کہ اس کے اندر کوئی عددی مرکزیت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ خلیفہ رشاد کی تحقیقات اگر درست نہ ہوں تو اس سے عظمت قرآن پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور اگر جزوی یا کلی طور پر درست ثابت ہو جائیں تو اعداد و شمار کا ایک کوہ گراں بھی قرآن حکیم کے اصل پیغام اور اس کے مقصد نزول سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ اگر کسی کو کہیں کوئی حسابی یا عددی ربط نظر آ جاتا ہے تو وہ حسن کلام ہے، اعجاز کلام ہے لیکن ان معنوں میں نہیں کہ اگر یہ ربط نہ ہو تو کتابِ الٰہی کی صداقت خطرے میں پڑ جائے گی۔ قرآن مجید کی متعدد آیات میں اہل ادب نے زبان و بیان کے صنائع و بدائع بیان کیئے۔ طوفانِ نوح علیہ السلام کے تذکرے پر مشتمل ایک آیت میں چالیس سے زیادہ صنعتیں دریافت کی گئیں۔ کچھ حضرات نے متضاد الفاظ میں غیر معمولی توازن دریافت کیا۔ کچھ کے نزدیک قرآن حکیم کی پیشین گوئیاں بہت دلچسپی کی حامل تھیں۔ کچھ اور لوگ قرآن کے بیان کردہ سائنسی حقائق کا تجزیہ کرتے رہے۔ غرض قرآن حکیم ہر صاحب غور و فکر کے لئے ہر روز نئے دروازے کھولتا رہا۔ ان سب باتوں کے باوجود تلاش و تحقیق کے علمبرداروں کا نہ تو شوقِ تحقیق ختم ہوا، نہ اس کتاب کے متعلق موجود معلومات سے پوری طرح آگاہ لوگ مزید کے نعرے سے دستبردار ہو سکے۔ اگر خلیفہ رشاد قرآن مجید میں کسی قسم کا عددی حسن دریافت کرلیں تو یہ ان کے ذوقِ تحقیق کے لئے ایک گراں بہا سرمایہ ہوگا۔ اور اگر ان کے دریافت کردہ نتائج علم و تحقیق کی نگاہ میں

غیر معتبر قرار پائیں تو یہ قرآن کی حقانیت کی نفی نہیں ہوگا بلکہ صرف خلیفہ رشاد جیسے محقق کی پروازِ فکر کی کوتاہی ہوگی۔

چنانچہ قرآن مجید کے متعلق ڈاکٹر رشاد اور بعد ازاں ان کے چند ہم خیال افراد کے تمام دعوؤں کو قبول بھی کیا جا سکتا ہے اور رد بھی کیا جا سکتا ہے لیکن ڈاکٹر رشاد کا ایک دعویٰ بہت سنگین ہے اور اس سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ وہ کہتا ہے کہ قرآن مجید کی نویں سورہ یعنی سورہ توبہ یا سورہ برأت کی آخری دو آیات جن کا شمار 128 اور 129 ہے، الہامی نہیں الحاقی ہیں۔ یعنی رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حیات طیبہ کے بعد ان آیات کو کسی نے خود بنا کر شامل قرآن کر دیا ہے۔ سورہ توبہ 127 ویں آیت پر ختم ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر موصوف کے دعوے اور دلیل کا خلاصہ درج ذیل ہے:

''سورہ 9، قرآن مجید کی واحد سورہ ہے جو بغیر بسملہ ہے۔ خدا نے اسے بغیر بسم اللہ اس لئے رکھا کہ اس سورہ میں ہونے والی تحریف کی طرف متوجہ کیا جا سکے۔ درحقیقت اس سورہ میں آیات 128 اور 129 الحاقی ہیں۔ اور پیغمبر ﷺ کی وفات کے بعد قرآن میں بڑھائی گئی ہیں۔ صحیح بخاری، سیوطی کی الاتقان اور تفسیر ابن کثیر وغیرہ سے ثابت ہے کہ بعد رسولؐ، قرآن کی ہر آیت ایک سے زیادہ گواہیوں پر شاملِ قرآن کی گئی جبکہ سورہ 9 کی یہ دو آیتیں محض ایک گواہ خزیمہ ابن ثابت الانصاری کے کہنے سے شامل کی گئیں۔ جب کچھ لوگوں نے اس خلافِ ضابطہ اقدام پر اعتراض کیا تو کوئی شخص ایک حدیث کے ساتھ نمودار ہوا کہ خزیمہ کی ایک گواہی دو کے برابر ہے۔۔۔۔۔ مندرجہ بالا حوالوں سے یہ بھی ظاہر ہے کہ

محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے چچا زاد بھائی علی (علیہ السلام) اس بات سے آگاہ تھے کہ جھوٹی آیتیں قرآن میں شامل کی گئی ہیں۔ اور انہوں نے کہا تھا کہ وہ اس سلسلہ میں کوئی قدم اٹھانے جا رہے ہیں۔ اور انہوں نے ایسا کیا بھی۔ وہ خود اور ان کے بیٹے حسین (علیہ السلام)، مذکورہ دونوں جھوٹی آیات کو قرآن سے نکالنے کے لئے جنگ کرتے رہے۔ ان دونوں کی جنگیں اور شہادت ان جھوٹی آیات کے قرآن سے خارج کرنے کے لئے تھیں۔ وہ حصول اقتدار کے لئے نہیں لڑ رہے تھے یہ بات تو ان کے دشمنوں اور دشمنوں کے ہوا خواہوں کی طرف سے اڑائی گئی ہے۔

ان دو آیات کے الحاقی ہونے کا ایک ثبوت یہ ہے کہ پوری سورہ 9 مدنی ہے، لیکن ان دو آیات کو مکی بنایا گیا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ مکی آیات خزیمہ انصاری کے پاس سے برآمد ہوں جب کہ وہ مدنی ہیں۔

یہ دونوں جھوٹی آیتیں اللہ کی مرضی سے داخل قرآن ہوئیں۔ اور ان کو اس لئے قرآن میں شامل ہونے دیا گیا تا کہ بعد ازاں (خلیفہ رشاد کے ذریعہ) یہ ثابت ہو سکے کہ قرآن کا حسابی نظام اس لئے بنایا گیا ہے کہ جھوٹ قرآن میں شامل نہ ہو سکے۔''

پہلے تو ثبوت نمبر ایک ملاحظہ فرمائیں۔ ڈاکٹر موصوف کے مطابق یہ دونوں آیتیں مکی ہیں اور خزیمہ انصاری اس کے گواہ ہیں۔ تو مدینہ میں رہنے والے کے پاس مکی

آیات کیسے برآمد ہوئیں؟

اس سلسلے میں گزارش ہے کہ آیات کا مکی یا مدنی ہونا نہ فرمانِ الٰہی ہے، نہ ارشادِ رسولؐ یہ فقط مفسرین کے اپنے قیاسات یا زیادہ سے زیادہ ان کی معلومات ہیں اور ان قیاسات یا معلومات میں بھی مفسرین متفق نہیں ہیں۔ اگر تھوڑی سی توجہ سے کام لیا جائے تو آیات کا مضمون خود بتا رہا ہے کہ یہ آیات مدینہ میں نازل ہوئیں کیونکہ آیات کے مخاطب صرف اور صرف مسلمان ہیں۔ آیات ملاحظہ ہوں:

﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۱۲۸) فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ(۱۲۹)﴾۔

ترجمہ: تم ہی میں سے ایک رسول تمہارے پاس آیا ہے۔ تمہارا تکلیف اٹھانا اس پر شاق گزرتا ہے۔ تمہاری بھلائی کا بڑا ہی خواہشمند ہے۔ مومنوں پر نہایت ہی شفیق، بڑا ہی مہربان ہے۔ اور اگر وہ پھر جائیں تو کہہ دو کہ مجھے تو اللہ ہی کافی ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں نے اسی پر بھروسہ کیا ہے اور وہ بہت بڑے عرش کا پروردگار ہے۔"

اب یہ ہر شخص سوچ سکتا ہے کہ یہاں ایمان لانے والوں کے ساتھ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت اور شفقت کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس شفقت و عنایات و کرم کے باوجود اگر امت کے احسان فراموش لوگ آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روگردانی اختیار کریں، ان کی نافرمانی کریں تو یہ نہ سمجھیں کہ اس

طرزِ عمل سے رسولؐ کی ذات کو کوئی نقصان پہنچا سکیں گے۔ ان کی محبت و شفقت امت کے کسی فرد کی حمایت یا مدد کے لئے نہیں ہے۔ وہ کسی سے نہ کوئی توقع رکھتے ہیں نہ کسی کو اپنا ناصر اور حمایتی بنانے کے لئے اظہارِ شفقت کرتے ہیں۔ ان کا مکمل انحصار اللہ کی ذات پر ہے۔ ساری گفتگو میں اولاً مومنین کو مخاطب کرکے بات ہو رہی ہے اور ﴿تولوا﴾ (تم پلٹ جاؤ۔ پھر جاؤ۔ واپس ہو جاؤ) کا لفظ بتا رہا ہے کہ بات ان سے ہے جو اسلام کو قبول کر چکے ہیں۔ کافروں کے پلٹنے کا کیا مطلب؟ غرض یہ دونوں آیتیں قرائن کے اعتبار سے مدنی ہیں، مکی نہیں۔

پھر یہ اللہ نے نہیں فرمایا۔ خود رسول ﷺ نے نہیں فرمایا۔ صحابہ بصورتِ اجماع نہیں کہہ رہے بلکہ بعد کے (تمام نہیں، کچھ) مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ آیات مکی ہیں تو خلیفہ رشاد ایک طرف منکر حدیث ہے۔ اور انکارِ حدیث کا سبب یہ بتاتا ہے کہ اس میں صحابہ نے اس قدر ملاوٹ کر دی ہے کہ اب اس میں سے حقیقت تلاش کرنا ممکن نہیں۔ تو کیا یہ انتہائی مضحکہ خیز بات نہیں ہے کہ ایک شخص رسول ﷺ کی بات نہ مانے، صحابہ پر غلط بیانی اور دھوکہ دہی کا الزام لگائے اور محض کچھ مفسرین کے صرف اس قدر کہہ دینے پر کہ یہ آیات مکی ہیں، اس طرح ایمان لے آئے کہ اللہ کے کلام میں تحریف کا قائل ہو جائے؟

ایک قدم اور آگے بڑھایئے۔ مان لیا کہ ان دو آیتوں کو مفسرین نے مکی بنایا ہے اور خزیمہ ابن ثابت انصاری یا مدنی ہیں۔ تو اب استدلال کی صورت کیا بنی۔ یہی کہ ایک مدنی کے پاس مکہ میں نازل ہونے والی آیات کیسے برآمد ہو گئیں۔ خلیفہ رشاد خود نہ مکی ہے نہ مدنی، شائد مصری ہے یا پھر امریکی ہوگا۔ لیکن اس کے پاس مکی اور مدنی تمام آیات کا مجموعہ قرآن مجید موجود ہے تو کیا ہم اس کے پاس سے برآمد ہونے والے

پورے قرآن کو الحاقی قرار دے دیں؟ بالکل صاف سی بات ہے کہ جو شخص بھی اسلام لائے گا۔ اس کے لئے قرآن سے آگاہی ناگزیر ہوگی۔ کیا مدینہ کے مسلمانوں کو ایمان لانے کے بعد اس جزوِ قرآن کی ضرورت نہیں تھی جو مکہ میں نازل ہوا تھا؟ یہ تو آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد کا واقعہ ہے۔ اس وقت تک تو ہر مسلمان کی کوشش رہی ہوگی کہ اس کے پاس پورا یا کم از کم زیادہ سے زیادہ قرآن موجود ہو۔ ایسی حالت میں خزیمہ کے پاس دو مکی آیات کا مل جانا حیرت کا باعث کیوں ہے؟

خلیفہ رشاد کی تاریخ سے آگہی کا اندازہ تو اس کے اسی حیران کن انکشاف سے ہو جاتا ہے کہ حضرت علی اور امام حسین علیہما السلام کی لڑائیاں اور شہادتیں ان دو آیات کو قرآن سے نکالنے کے لئے تھیں۔ لیکن اگر وہ اسلامی کتب اٹھا کر دیکھتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ مدینہ میں خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کئی سال بعد ہوئی ہے اور قرآن کی مکی آیتیں پہلے مدینہ پہنچی ہیں۔ مدینہ کے جو لوگ مکہ آکر ایمان لاتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کو قرآن کا نازل شدہ حصہ دیتے تھے کہ اس کے ذریعہ اہل مدینہ کو دعوت اسلام دیں۔ علاوہ ازیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قاریٔ قرآن مصعب ابن عمیر اور ابن ام مکتوم کو اہل مدینہ کے ہمراہ مدینہ بھیجا کہ یہ دونوں حضرات مدینہ والوں کو قرآن کی تعلیم دیں۔ اور پھر آپؐ کے مدینہ تشریف لانے کے بعد تو حفظ و کتابت و قرأت قرآن کی ایک مہم شروع ہوگئی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر سال ماہِ رمضان میں مدینہ میں موجود تمام قاریانِ قرآن اور کاتبوں کو جمع کرتے اور ان کے سامنے اس وقت تک نازل شدہ قرآن کی مکمل تلاوت فرماتے۔ ہجرت مدینہ کے بعد قرآن صرف قرآن تھا اور اس کے مکی یا مدنی نزول کا قاریانِ قرآن سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

الغرض اس بات میں کوئی وزن نہیں ہے کہ ایک مدنی شخصیت کے پاس سے مکی

آیات کا برآمد ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ آیات وضعی ہیں۔

خلیفہ رشاد نے سورہ توبہ کی آخری دو آیات کے الحاقی ہونے کی دوسری دلیل اپنے مخصوص حسابی اسلحہ خانے سے برآمد کی ہے۔ اس کا بنایا ہوا ''قرآن کا حسابی نظام'' کس طرح زیر بحث دو آیات کو الحاقی ثابت کرتا ہے۔ ذرا ان نادر الوجود دلائل کو بھی دیکھ لیجیے۔ ڈاکٹر رشاد لکھتا ہے:

''جدول نمبر 1 قرآن کا 19 کے عدد پر مبنی حسابی ڈھانچہ، ان آیات کو استعمال کرتے ہوئے جن کا نمبر شمار 128 اور 129 ہے۔ یا جن کا جزو ضربی یہ دو نمبر ہیں۔

سورہ کا نمبر شمار 1	سورہ میں آیات کا شمار 2	سورہ میں ان آیات کی تعداد جن کا جزو ضربی 128 اور 129 ہے 3	آیات کا نمبر شمار جو 128، 129 کا جزو ضربی ہیں 4	جزو ضربی آیات کے نمبر شمار کا مجموعہ 5
2	286	4	128,129,256,258	771
3	200	2	128,129	257
4	176	2	128, 129	257
6	165	2	128, 129	257
7	206	2	128, 129	257
16	128	1	128	128
20	135	2	128, 129	257

257	128, 129	2	227	26
257	128, 129	2	182	37
2698	**میزان**	**19**	**1705**	**121**

142x19 = 2698

اس جدول سے ڈاکٹر خلیفہ رشاد کا طرز استدلال بخوبی سمجھ میں آجاتا ہے۔ طرح طرح کے بہت سے اعداد و شمار جمع کر کے اس میں کوئی ایک ایسا مجموعہ بنا لینا جو 19 سے پورا تقسیم ہو جائے اور پھر یہ دعویٰ کرنا کہ قرآن کا محور 19 ہے۔ آخر کسی سورہ کی مخصوص آیات کے محض نمبر شمار کو کیوں جمع کیا جائے اور حاصل جمع کو 19 سے کیوں تقسیم کیا جائے۔ اور اگر کسی قانون سے یہ تقسیم جائز ہو بھی تو زیادہ سے زیادہ یہ پتہ چلا کہ اگر 128+129=257 کے ایک اور جزو کو جمع کر لیں تو 19 سے تقسیم نہیں ہوتا۔ تو سورہ توبہ کی دو آیات کو الحاقی کیوں سمجھا جائے۔ ڈاکٹر رشاد کی تسلیم کردہ سورتوں میں سے آٹھ ایسی سورہ ہیں جن میں 128 اور 129 نمبر کی آیات آتی ہیں۔ ان میں سے کسی سورہ کی ان دو آیات کو الحاقی قرار دیا جا سکتا ہے۔ آخر سورہ توبہ ہی کیوں؟ اس کا جواب خلیفہ رشاد نے یہ کہہ کر دیا ہے کہ اس سورہ کے آغاز میں بسملہ نہیں تھا۔ یہ اللہ نے علامت رکھی تھی تاکہ جب 19 کے فارمولے کے خصوصی استعمال پر دو آیتیں قرآن سے نکالنی پڑیں تو خلیفہ رشاد کی نظر سورہ برأت کی آیات پر جا پڑے۔ میں کہوں گا کہ بسم اللہ کے نہ ہونے سے آپ نے یہ نتیجہ نکالا، میں یہ نتیجہ نکلتا ہوں کہ اللہ نے اس سورہ میں بسم اللہ اس لئے نہیں رکھی تاکہ آنے والی نسلیں متوجہ رہیں کہ خلیفہ رشاد کا حسابی فارمولا اسی سورہ میں پہنچ کر دم توڑے گا اور یہاں اس کا 19 کے عدد سے بنایا گیا محل دھڑام سے پیوند خاک ہو جائے

گا۔

لیکن ہمیں 19 کے عدد کی اہمیت کم کرنے سے کوئی خوشی نہیں ہوگی۔ آیئے ڈاکٹر خلیفہ رشاد کے گوشوارے میں سورہ توبہ کے اعداد بھی شامل کریں۔ اور پھر دیکھیں کہ پُراسرار 19 ہمارے مسئلہ میں کیا فیصلہ سناتا ہے۔

گزشتہ گوشوارے کے کالم نمبر	1	2	3	4	5
گزشتہ کالموں کا میزان	121	1705	18	2698	2698
سورہ توبہ کے اعداد	9	129	2	128,129	257
سورہ توبہ کو شامل کر کے میزان	130	1834	21	2955	2955

خلیفہ رشاد نے دیکھنے میں بڑا طول طویل گوشوارہ بنایا۔ اس کے بنائے ہوئے پانچ کالموں میں سے کالم 4 اور کالم 5 محض ایک دوسرے کی بے معنی تکرار ہے۔ اور کالم ایک تا تین محض نمائش کے لئے ہیں۔ نتائج سے ان کا تعلق نہیں۔ اس نے صرف کالم 4 میں جو آیت 129,128 کا نمبر شمار لکھا ہے محض ان اعداد کو جمع کر لیا ہے۔ اس جمع کرنے کی نہ کوئی منطق ہے نہ سبب۔ سوائے اس کے کہ ہر کالم کا الگ الگ مجموعہ بھی 19 سے تقسیم نہیں ہوتا ماسوائے کالم 5 کے، اور ان تمام کالموں کی حاصل جمع بھی 19 سے تقسیم نہیں ہوتی تھی۔ لیکن چونکہ ڈاکٹر رشاد کو کسی نہ کسی طرح سورہ توبہ 9 کی آیات 128 اور 129 کو خارج از قرآن کرنا تھا اس لئے صرف کالم 4 کے مجموعہ پر اکتفا کر لی۔ کیونکہ وہ مجموعہ سورہ توبہ کے اعداد کو شامل کیئے بغیر 19 سے تقسیم ہو جاتا تھا۔ لیکن ہم کیوں نہ نسبتاً زیادہ معقول طریقہ اختیار کریں اور ڈاکٹر رشاد کی فہرست میں نویں سورہ کے اعداد کو شامل کرتے ہوئے پہلے سے چوتھے کالم تک کے سارے اعداد جمع کر لیں۔ یعنی:

کالم 1 + 2 + 3 + 4 = 130 + 1834 + 21 + 2955 = 4940

= 19 x 260 = 4940

اب میں ہر صاحب انصاف سے سوال کرتا ہوں کہ ڈاکٹر رشاد کے فارمولے سے نویں سورہ کی دو آیات جزو قرآن ثابت ہوتی ہیں یا صورتِ حال وہ ہے جس کا دعویٰ خلیفہ رشاد نے کیا ہے؟

اب رہ گئی تاریخی بحث کہ سورۂ برأت کی دو آیات صرف خزیمہ بن ثابت سے ملیں اور اس بنیاد پر جزو قرآن بنائی گئیں کہ کسی نے کہہ دیا تھا کہ خزیمہ کی گواہی دو افراد کے برابر ہے۔ یقیناً یہ بخاری کی روایت ہے۔ لیکن خلیفہ رشاد کا تو دعویٰ ہے کہ کوئی حدیث کوئی روایت سوائے قرآن کے قابل قبول نہیں۔ اور حدیث کی تمام کتابیں ہی نہیں ہر حدیث تحریف شدہ ہے۔ ایسی صورت میں انہیں بخاری، سیوطی یا ابن کثیر کی کہی ہوئی بات پر محض شک کی بنیاد پر اس قدر بڑا فیصلہ نہیں کرنا چاہیئے کہ قرآن نعوذ باللہ محرّف ہے۔ انہیں تو اس سلسلہ میں خود قرآن سے پوچھنا چاہیئے کہ وہ اپنی حفاظت کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ قرآن مجید کا حتمی اور دوٹوک اعلان ہے کہ:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾

''ہم ہی نے ذکر (قرآن) نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔'' (سورۃ الحجر، 9:15)

اب خلیفہ رشاد جس ''قرآن اور صرف قرآن'' کو مانتا ہے وہ قرآن دعویٰ کر رہا ہے کہ قرآن محفوظ ہے اس لئے کہ اللہ کی زیر حفاظت ہے اور جس حدیث یا روایت کو وہ نہیں مانتا وہ کہہ رہی ہے کہ سورہ توبہ کی آخری آیات صرف ایک شخص کے کہنے پر شامل قرآن کی گئیں۔ اب ڈاکٹر رشاد کے پیروکار فیصلہ کریں کہ ہم قرآن کی بات سنیں یا روایت کی۔

خلیفہ رشاد کے مطالعہ میں شاید یہ بات نہیں رہی کہ قرآن مجید گواہوں کی بنیاد پر قرآن نہیں کہلاتا بلکہ متواتر ہونے کی بنا پر قرآن ہے۔ شاید یہ اصطلاحات انکارِ حدیث کرنے والوں کے لئے اجنبی ہوں اس لئے وضاحت کر دوں کہ قرآن مجید دو دو گواہوں یا خزیمہ ابن ثابت کی ایک گواہی پر جمع نہیں ہوا بلکہ عہد رسالت میں خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن جمع بھی کر دیا تھا اور اس کی اس قدر نشر و اشاعت کر دی تھی کہ سینکڑوں اصحاب قرآن کے حافظ تھے۔ بہت سے حضرات کے پاس تحریری صحیفے تھے۔ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن کو اس قدر عام کر دیا تھا کہ اس میں کوئی فردِ واحد خواہ کیسا ہی بااختیار کیوں نہ ہو، جرأت نہیں کر سکتا تھا کہ قرآن میں معمولی سے معمولی ردو بدل کر سکے۔ ڈاکٹر رشاد نے جن کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔ ان ہی میں یہ واقعہ بھی موجود ہے کہ ایک خلیفہ نے ایک آیت میں صرف ایک لفظ واؤ کو ہٹانے کی فرمائش کی تھی تو قاریٔ قرآن ابی ابن کعب نے کہا تھا کہ اگر ایک دفعہ پھر مجھ سے قرأتِ رسولؐ کے خلاف قرأت کے لئے کہا گیا تو میں فرمائش کرنے والے کا سر پھاڑ دوں گا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حیاتِ طیبہ میں قرآن کو اس قدر عام کر دیا تھا کہ کسی ایک نسخہ میں سہواً یا ارادتاً کسی تحریف کا رواج پانا ممکن نہیں تھا۔

خلیفہ رشاد کو غالباً یہ بھی معلوم نہ ہو کہ زید ابن ثابت کے ہاتھ کا لکھا ہوا وہ قرآن جس میں خزیمہ بن ثابت نے دو آیتیں لکھوائی تھیں، اپنے وجود میں آنے کے تیس سال کے اندر اندر نذرِ آتش ہو چکا تھا۔ لیکن وہ ان علی علیہ السلام کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کم و بیش 20 قرآن اور حسین علیہ السلام کا تحریر کردہ کم از کم ایک قرآن آج بھی دنیا کے مختلف عجائب گھروں اور کتب خانوں میں موجود ہیں، جن علی و حسین علیہما السلام کے متعلق خلیفہ رشاد کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے سورہ توبہ میں شامل کی جانے والی ان آیات کی مخالفت کی، اس الحاق

کے خلاف جنگ کی اور آخر اسی سلسلہ میں شہید کر دیئے گئے۔۔۔۔۔ ڈاکٹر رشاد کا دعویٰ ایک بے دلیل دعویٰ ہے لیکن ان ہستیوں کے دست ہائے مبارک سے تحریر شدہ قرآن ایک حقیقت ہیں اور ان میں یہ دونوں آیات اسی طرح موجود ہیں جیسے کسی اور نسخہ میں ہیں۔

اسلامی کتب میں ہر دو طرح کی روایات موجود ہیں۔ قرآن مجید حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگرانی میں ترتیب بھی پا چکا تھا اور جمع بھی ہو چکا تھا۔ اور یہ کہ یہ اصحابؓ کے ہاتھوں بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جمع اور مرتب ہوا۔ ان دوسری قسم کی روایات میں شدید اختلاف اور اضطراب پایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ خلافِ عقل بھی ہے کہ اللہ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کتاب پہنچانے اور کتاب وحکمت کی تعلیم دینے کے لئے بھیجے اور رسولؐ یہ سارا کام خود کرنے کی بجائے اہلیت نہ رکھنے والی امت کے سپرد کر جائیں۔ لیکن ہمارے نقطۂ نظر سے قطع نظر، خلیفہ رشاد کی اپنی مجبوری ہے کہ وہ قرآن مجید کو عہد رسالت کا ترتیب دیا ہوا تسلیم کریں۔ کیونکہ ان کے حسابی جمع تفریق کا بہت بڑا حصہ سوروں اور آیات کے نمبر شمار سے تعلق رکھتا ہے۔ بلکہ وہ اپنی تحریروں میں کسی سورۃ کا نام درج کرنے کی بجائے اس کو اس کے نمبر شمار کے ذریعہ متعارف کراتے ہیں۔ اب اگر خزیمہ بن ثابت اور زید ابن ثابت وغیرہ کا جمع قرآن درست ہے تو قرآن کی آیات کے مشکوک ہونے کے علاوہ، ان آیات یا سورتوں کی ترتیب سے کوئی معجزاتی نتیجہ نہ نکل سکتا ہے، نہ ایسا کرنا درست ہوگا۔۔۔۔۔ اور اگر جمع وترتیب قرآن عہد رسالت میں ہوا ہے تو خزیمہ کی اکلوتی گواہی اور باقی آیات پر دو دو گواہی قرآن کی صحت پر اثر انداز نہیں ہوسکتیں۔

دراصل ان دو آیات کا نہ ملنا اور خزیمہ کی گواہی وغیرہ کی پوری روایت کا جمع قرآن جیسے ضروری معاملے سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ محض حکومت کی ذاتی مجبوری تھی کہ

کے خلاف جنگ کی اور آخر اسی سلسلہ میں شہید کر دیئے گئے۔۔۔۔۔ڈاکٹر رشاد کا دعویٰ ایک بے دلیل دعویٰ ہے لیکن ان ہستیوں کے دست ہائے مبارک سے تحریر شدہ قرآن ایک حقیقت ہیں اور ان میں یہ دونوں آیات اسی طرح موجود ہیں جیسے کسی اور نسخہ میں ہیں۔

اسلامی کتب میں ہر دو طرح کی روایات موجود ہیں۔قرآن مجید حضور ﷺ کی نگرانی میں ترتیب بھی پا چکا تھا اور جمع بھی ہو چکا تھا۔اور یہ کہ یہ اصحابؓ کے ہاتھوں بعد پیغمبر ﷺ جمع اور مرتب ہوا۔ ان دوسری قسم کی روایات میں شدید اختلاف اور اضطراب پایا جاتا ہے۔علاوہ ازیں یہ خلافِ عقل بھی ہے کہ اللہ اپنے رسول ﷺ کو کتاب پہنچانے اور کتاب وحکمت کی تعلیم دینے کے لئے بھیجے اور رسولؐ یہ سارا کام خود کرنے کی بجائے اہلیت نہ رکھنے والی امت کے سپرد کر جائیں۔لیکن ہمارے نقطۂ نظر سے قطع نظر، خلیفہ رشاد کی اپنی مجبوری ہے کہ وہ قرآن مجید کو عہد رسالت کا ترتیب دیا ہوا تسلیم کریں۔کیونکہ ان کے حسابی جمع تفریق کا بہت بڑا حصہ سوروں اور آیات کے نمبر شمار سے تعلق رکھتا ہے۔ بلکہ وہ اپنی تحریروں میں کسی سورۃ کا نام درج کرنے کی بجائے اس کو اس کے نمبر شمار کے ذریعہ متعارف کراتے ہیں۔اب اگر خزیمہ بن ثابت اور زید ابن ثابت وغیرہ کا جمع قرآن درست ہے تو قرآن کی آیات کے مشکوک ہونے کے علاوہ، ان آیات یا سورتوں کی ترتیب سے کوئی معجزاتی نتیجہ نہ نکل سکتا ہے، نہ ایسا کرنا درست ہوگا۔۔۔۔اور اگر جمع وترتیب قرآن عہد رسالت میں ہوا ہے تو خزیمہ کی اکلوتی گواہی اور باقی آیات پر دو دو گواہی قرآن کی صحت پر اثر انداز نہیں ہو سکتیں۔

دراصل ان دو آیات کا نہ ملنا اور خزیمہ کی گواہی وغیرہ کی پوری روایت کا جمع قرآن جیسے ضروری معاملے سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ محض حکومت کی ذاتی مجبوری تھی کہ

انکے پاس کوئی ایک بھی نسخہ قرآن نہیں تھا۔ جب کہ مدینہ کے کئی گھروں میں، حتی کہ بعض بیوہ عورتوں کے پاس قرآن کی ایک نہ ایک جلد موجود تھی۔ دوسری طرف حضرت علی علیہ السلام کا قرآن سے وابستگی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ قرآن کی باقاعدہ نقلیں تیار کرنے اور اس میں تفسیری تشریحات لکھنے میں اس قدر مصروف ہیں کہ گھر سے باہر نہیں نکلیں گے۔ یہ ساری صورتِ حال حکومت کے لیئے سخت تشویش کا باعث تھی کہ خود کو نائب رسولؐ کہنے والے خود کو قرآن سے وابستہ کیسے ثابت کریں؟ اس اثناء میں ستم یہ ہوا کہ حضرت علی علیہ السلام قرآن حکیم کی ایک نقل (ماسٹر کاپی) تیار کر کے اربابِ اقتدار کے پاس آ گئے اور انہیں بھرے مجمع میں پیشکش کی کہ اس جلد کو اپنے پاس رکھ لیں۔ حکمرانوں کے لیئے یہ بڑی دشوار گھڑی تھی۔ اگر علی علیہ السلام کا قرآن قبول کرلیا جائے تو قرآن اور رسولؐ سے حکمرانوں کی لاتعلقی اور علی علیہ السلام کا گہرا ربط ثابت ہوتا ہے۔ اگر اس قرآن کو رد کر دیں تو عام مسلمانوں کو کیسے بتائیں کہ پیغام رسالتؐ قرآن سے حکومت کا کوئی تعلق نہیں ۔۔۔۔۔ چنانچہ ضرورت تھی کہ علی علیہ السلام سے قرآن نہ لیا جائے اور کسی سے ایک نقل تیار کرا کے حکومت اپنی تحویل میں رکھ لے۔ حالات کے تقاضوں نے مجبور کیا کہ کسی بزرگ صحابی کی خدمات حاصل کرنے کی بجائے کتابت قرآن کے لیئے ایک ۲۳، ۲۴ سال کے انصاری نوجوان زید ابن ثابت سے کہا گیا کہ وہ ایک نسخۂ قرآن تیار کر دیں۔ زید ابن ثابت اس کام کے لئے قطعاً اہل نہیں تھے۔ پہلے تو انہوں نے طرح طرح کے عذر پیش کیئے اور یہ اعتراف کیا کہ اس کام کی بجائے انہیں کوہِ احد اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پر رکھنے کو کہا جاتا تو وہ آسان ہوتا۔ لیکن آخرکار رضامند ہو گئے۔ اب اس کام کیلیئے نہ ان کے پاس قرآن حکیم کی کوئی نقل تھی اور نہ وہ خود حافظ قرآن تھے چنانچہ مسجد کی سیڑھی پر بیٹھ گئے اور سرکاری سطح پر اعلان ہو گیا کہ لوگ ان کے سامنے آ کر قرآن سناتے

رہیں اور وہ دو دو گواہیوں پر لکھتے رہیں۔ ایسے موقع پر خزیمہ ابن ثابت نے دو ایسی آیتیں سنائیں کہ اتفاق سے اس کی کوئی گواہی نہیں آئی۔ ان آیتوں کی گواہی کیلئے اعلانِ عام کرنا سیاست وقت کے تقاضوں کے خلاف تھا۔ کیونکہ اس طرح قرآن لکھنے والوں کی اپنی لاعلمی کا اظہار ہوتا کہ کسی جزو قرآن کے قرآن ہونے یا نہ ہونے کی تصدیق نہیں کر سکتے اس۔ لئے خزیمہ کی گواہی کو دو کے برابر قرار دے کر وہ آیات لکھ لی گئیں۔

اس طرح جو نسخۂ قرآن تیار ہوا تھا وہ محض ایک علامتی نسخہ تھا اور اسے تقریباً 20 سال تک کبھی کسی نے کھول کر نہیں دیکھا تھا۔ کہنے کو یہ نسخۂ قرآن حضرت ابوبکر کو پیش کیا گیا۔ پھر ان سے حضرت عمر کے پاس آیا۔ بعد ازاں ان کی صاحبزادی ام المومنین حفصہ کے پاس رکھا رہا۔ حتیٰ کہ حضرت عثمان کے عہد میں پھر ضرورت محسوس ہوئی کہ قرآن حکیم کا کوئی سرکاری نسخہ بھی ہونا چاہیئے۔ اس غرض سے اس مرتبہ ایک چار رکنی کمیشن بنایا گیا جس کے سربراہ سابقہ تجربہ کار زید ابن ثابت بنائے گئے۔ اس کمیٹی نے حضرت حفصہ کے پاس موجود نسخۂ قرآن منگوایا تو دو باتوں کا انکشاف ہوا ایک تو یہ کہ اس قرآن کو کسی نے ایک مرتبہ بھی نہیں پڑھا۔ دوسرے یہ کہ یہ نسخہ انتہائی ناقص ہے۔

اس سلسلہ میں خود امام بخاری کی منتخب کردہ ایک روایت نے ان حقیقتوں کا انکشاف کیا۔ انہوں نے اپنی صحیح کی چوتھی جلد میں (پارہ-20) کتاب التفسیر میں ایک باب جمع القرآن (شمار باب 961) میں وہ واقعات جمع کیئے ہیں جو ''جمع قرآن'' کے سلسلہ میں عہد ابوبکر میں پیش آئے۔ سورہ توبہ کی دو آیتوں کا صرف خزیمہ سے حاصل ہونا اسی روایت میں بیان ہوا ہے۔۔۔۔۔ اس کے بعد 962 نمبر کی روایت میں عہد عثمانی میں ''جمع قرآن'' کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اس تفصیلی روایت کا ایک جزو جو ہماری اس وقت کی بحث سے متعلق ہے، ملاحظہ ہو۔

''۔۔۔۔۔حضرت عثمان نے ام المومنین حفصہ کو کہلا بھیجا کہ اپنا مصحف ہمارے پاس بھیج دو ہم اس کی نقلیں اتار کر کے پھر تم کو واپس کر دیں گے۔ ام المومنین حفصہ نے بھیج دیا۔ حضرت عثمان نے زید بن ثابت اور عبداللہ ابن زبیر اور سعید ابن عاص اور عبد الرحمٰن ابن حارث بن ہشام کو حکم دیا۔ انہوں نے اس کی نقلیں اتاریں۔ حضرت عثمان نے تینوں قریش کے لوگوں (زید کے علاوہ باقی تین) سے یہ بھی کہلایا اگر کہیں تم میں اور زید بن ثابت میں قراۃ میں اختلاف ہو تو قریش کے محاورے کے موافق لکھنا اس لئے کہ قرآن ان ہی کے محاورے پر اترا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ جب مضمون کو تیار کر چکے تو حضرت عثمان نے ام المومنین حفصہ کا مصحف تو ان کو واپس کر دیا اور ان مصحفوں میں سے ایک ایک مصحف ہر ملک میں بھجوایا اور اس کے سوا جتنے الگ الگ پرچوں اور ورقوں میں قرآن لکھا ہوا لوگوں کے پاس تھا سب کے سب جلا دینے کا حکم دیا۔ ابن شہاب نے کہا مجھ سے خارجہ ابن زید ابن ثابت نے بیان کیا، انہوں نے زید ابن ثابت سے سنا وہ کہتے تھے جس زمانے میں ہم مصحف لکھ رہے تھے اس وقت سورہ احزاب کی ایک آیت کا پتہ نہ چلا۔ وہ حضرت حفصہ کے مصحف میں بھی نہیں تھی اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وہ آیت پڑھتے سنا تھا۔ آخر ہم نے اس کی تلاش کی۔ پھر وہ خزیمہ بن ثابت انصاری سے ملیں، وہ آیت یہ ہے:

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ﴾

ہم نے اس کو سورہ احزاب میں لگا دیا۔''

بخاری کی اس روایت سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ زید ابن ثابت کا لکھا

ہوا قرآن صرف یہ بتانے کے لئے تھا کہ ہمارے پاس بھی قرآن ہے ورنہ یہ ممکن نہیں کہ حضرت عمر موداس قرآن سے تلاوت کریں اوران کو سورۂ احزاب میں ایک آیت کی کمی کا احساس ہی نہ ہو۔ خیال رہے کہ یہ قرآن بعد میں بھی کام نہیں آیا اور علامہ وحید الزماں، شارح صحیح بخاری نے اس روایت کی شرح کرتے ہوئے بتایا کہ یہ نسخۂ قرآن حضرت حفصہ کے پاس رہا۔ مروان ابن حکم نے ام المومنین سے مانگا لیکن انہوں نے دینے سے انکار کر دیا۔ ام المومنین کے انتقال کے بعد مروان نے دھوکہ دے کر یہ نسخہ حاصل کیا اور اسے نذر آتش کر دیا۔

اس نادر نسخہ کو جلائے جانے کا سبب خود مروان نے بتایا کہ اگر نہ جلایا جاتا تو مسلمانوں میں فساد پیدا ہو جاتا۔ دوسرے لفظوں میں زید ابن ثابت نے اس کی تحریر میں اس قدر غلطیاں اور کوتاہیاں کی تھیں کہ اس کا منظر عام پر آنا ایک طوفان عظیم کا سبب بنتا۔۔۔۔۔اس ساری گفتگو سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ خزیمہ ابن ثابت کی اکلوتی گواہی سے جو قرآن لکھا گیا اس کا آج کے قرآن پر ذرہ برابر بھی اثر نہیں۔ اور اگر زید کو ان آیات کا خود علم نہیں تھا تو یہ ان کی اہلیت کو مشکوک بناتا ہے۔ اس کا کوئی اثر قرآن مجید کی صحت پر نہیں پڑتا۔

اور اب اسی سلسلہ کی آخری بات کہ بخاری، اتقان اور تفسیر ابن کثیر کی بیان کردہ روایت (کہ خزیمہ کی اکلوتی گواہی پر سورہ توبہ میں دو آیات بڑھائی گئیں) کی بنیاد پر خلیفہ رشاد ان دونوں آیتوں کو خارج از قرآن کر رہے ہیں۔ تو وہی بخاری، اتقان اور تفسیر ابن کثیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ سورۂ احزاب میں بھی ایک آیت دور عثمان میں صرف خزیمہ کی گواہی پر شامل کی گئی۔ تو اب اس آیت کو بھی کتاب الٰہی سے خارج کیجئے۔ بلکہ سورۂ توبہ کی آیتیں تو عہد ابوبکر میں شامل کی گئیں تھیں کہ ابھی آنحضور ﷺ کے وصال

کو زیادہ وقت نہیں گزرا تھا اور لوگوں کو عہد رسالت کا قرآن حضور ﷺ کی زبان سے سنا ہوا یاد تھا۔ اگر بقول خلیفہ رشاد اس وقت قرآن میں دو آیتیں بلا دشواری کے شامل ہو گئیں تو بیس بائیس سال بعد دورِ عثمانی میں سورہ احزاب میں صرف خزیمہ کی شہادت پر ایک آیت کا اضافہ اور زیادہ مشکوک معاملہ ہو جاتا ہے۔ اگر ڈاکٹر رشاد کے خیال میں واحد گواہی کی وجہ سے سورہ توبہ میں آیات الحاقی ہیں تو اسے سورہ احزاب میں بھی ایک آیت کی شمولیت پر اعتراض ہونا چاہیئے تھا۔ اب اس کے علاوہ کیا کہا جائے کہ ڈاکٹر موصوف نے یا تو صحیح بخاری پڑھی نہیں، یا پڑھ لینے کے باوجود وہ ایک اور آیت کو خارج کر کے اپنے حساب کو مشکوک بنانا نہیں چاہتے تھے۔